جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں

چھٹا مجموعہ

جرم و سزا اور سراغ رسانی کی بے مثال سچی کہانیاں

احمد یار خان

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

فہرست

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں	۷
فرار کے راستے	۹۸
جذبات کے جنگل میں	۱۷۴
اس نے گناہ تو نہیں کیا	۲۶۱

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی کہانیوں کا چھٹا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔
ان چھ کہانیوں میں بھی آپ وہی دلچسپی، چاشنی، سنسنی اور جذباتی دُنیا میں زلزلے بپا کر دینے والا تاثر پائیں گے جو محترم احمد یار خان کی ہر کہانی میں آپ کو ملتا ہے۔ ایسی کہانیاں اکثر بلا تبصرہ پیش کی جاتی ہیں۔ کسی تعارف یا پیش لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے اچھا یا اچھا نہ ہونے کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جاتا ہے، پھر بھی میں ان کہانیوں کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ہمارے ہاں جُرم و جاسوسی کی کہانیوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت تفریح کا مطالبہ کرتی ہے۔ تفریح جو جُرم و جاسوسی کی کہانیوں میں ملتی ہے وہ کہانی کی کسی اور صنف میں نہیں مل سکتی۔ گھٹیا درجے کے ڈائجسٹ رسالے اور ناول جُرم و جاسوسی کی بدولت مقبول ہوئے لیکن یہ کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں اور یہ سب افسانے ہوتے ہیں۔ انہیں مزید دلچسپ اور لذیذ بنانے کے لیے ان میں جنسی لذت اور بغیر کسی جواز کے لڑائی مار کٹائی شامل کی جاتی ہے ـــــ یہ ایک کاروبار ہے

جوانوجوانوں اور کچّے ذہنوں کی اخلاقی قدروں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

محترم احمد یار خان کی کہانیوں میں بھی آپ کو تفریح کا اتنا ہی مواد ملے گا جتنا آپ چاہتے ہیں لیکن ان میں خوبی یہ ہے کہ یہ افسانے نہیں۔ یہ ہمارے اپنے معاشرے، ہماری اپنی لغزشوں اور ہماری اپنی ہٹ دھرمی کی وارداتیں ہیں۔ ان کے کرداروں کو آپ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی پیشہ ور مجرم نہیں بلکہ ایسے افراد قتل وغیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں جنہوں نے جُرم کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔

ان حقیقی کہانیوں میں آپ کو انسانی فطرت کے ایسے راز بھی ملیں گے جو ہم سب نے اپنی ذات میں چھُپا رکھے ہیں مگر ہم ان کی موجودگی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا یہی رویّہ بھیانک جرائم کا باعث بنتا ہے۔

ان کہانیوں میں آپ کو تفریح تو ضرور ملے گی اور اتنی ملے گی کہ آپ جو کہانی پڑھیں گے اسے ختم کر کے اٹھیں گے لیکن آپ بہت دیر ایک سوچ میں اُلجھے رہیں گے کہ ایسا کیوں ہُوا، ایسے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ کہانیاں نوجوان اور کچّے ذہن پر نشہ طاری نہیں کریں گی بلکہ ذہن کو بیدار کریں گی اور اس بیداری میں جو لُطف اور جو لذّت ہے وہ جُرم و جاسوسی کے افسانوں میں نہیں مل سکتی۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

جب بہن کی چُوڑیاں ٹُوٹیں

پولیس مین کی حیثیت سے میں پُورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ انسان کی تاریخ میں آج تک جنگوں، وباؤں، سیلابوں اور زلزلوں نے اتنے انسانوں کی جانیں نہیں لیں جتنی عورت نے لی ہیں۔ جنگ، وبا، سیلاب اور زلزلہ کبھی کبھی آتا ہے مگر عورت کی خاطر قتل اور خودکُشی کی وارداتیں ہر روز ہوتی ہیں اور صدیوں سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ قبیلے قبیلوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ خاندان خاندانوں سے لڑ جاتے ہیں۔ ہر روز اتنی وسیع دُنیا میں کسی نہ کسی گاؤں، قصبے اور شہر میں کوئی خاوند اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کو قتل کر کے خودکُشی کر لیتا یا سزائے موت لے لیتا ہے۔ بیویاں آشناؤں کے ساتھ مل کر خاوندوں کو قتل کر دیتی ہیں۔ باپ اور بھائی قتل یا خودکُشی کر لیتے ہیں۔ آج کل ایک نئی تہذیب نے دُنیا کو گرفت میں لے لیا ہے۔ پاکستان میں اس تہذیب کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کا یہ فائدہ سامنے آیا ہے کہ عورت کی خاطر قتل و غارت نہیں ہوتی، حالانکہ ناجائز آشنائی بڑھ گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اب کسی کی بہو بیٹی خراب ہو جاتی ہے تو گھر والے فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی ایڈوانس

ہے، سوشل ہے۔ خاوند بیویوں کا تعارف غیر مردوں سے خود کراتے اور نتائج کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔

مجھے اپنی سروس کے سینکڑوں ایسے واقعات یاد آتے ہیں کہ خاوند نے بدچلن بیوی کو یا بھائی نے بدچلن بہن اور اُس کے آشنا کو موقع پر پکڑ کر قتل کیا اور آلۂ قتل سمیت تھانے میں آگیا۔ میرے پاس ایسی بیویاں بھی آئیں جنہوں نے بدچلن خاوندوں کو دن دہاڑے قتل کیا اور میرے پاس اقبالِ جُرم کے لیے آگئیں۔ فوری اشتعال سے جو قتل کیا جاتا ہے اس کی سزا کم ہے بشرطیکہ اشتعال ثابت ہو جائے اور جب مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ قاتل حق بجانب تھا یا تھی تو میں استغاثہ میں گڑبڑ کر کے اُسے مزید فائدہ دلا دیا کرتا تھا۔ البتہ اُن قاتل مردوں اور عورتوں کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے جو بدکاری جاری رکھنے کی خاطر آشناؤں سے مل کر قتل کراتے تھے، میں استغاثہ کے خلاء جھوٹی شہادتوں سے پُر کر لیا کرتا تھا۔

قانون سے لوگ ڈرتے ہیں لیکن عدالتوں میں قانون وکیلوں کے الفاظ اور دلائل کے ہیر پھیر میں بے بس ہو کے رہ جاتا ہے۔ گناہگار صاف بچ کے نکل آتے ہیں۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گناہگار مجھے آزاد چلتا پھرتا نظر نہ آئے خواہ مجھے قانون اور سزا کا کوئی تقاضا پُورا کرنے کے لیے جھوٹ ہی بولنا پڑے۔ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ناجائز مراسم پیدا کرنے کا شغل مسلمانوں کے حصّے میں ہی آیا ہے۔ اور دلچسپی والی بات یہ ہے کہ مسلمان بدکاری میں بھی شیر ہیں اور جب بدکاری کے جراثیم کسی "مومن" کے اپنے گھر میں آجائیں تو قتل اور خودکشی

کی وارداتیں ہوتی ہیں لہٰذا میں اُنہیں "بدکار غیرتمند" کہا کرتا ہوں۔

جولائی ۱۹۴۰ء کی ایک صبح طلوع ہو رہی تھی۔ مجھے ایک کانسٹیبل نے گھر آکر بتایا کہ خودکشی کی ایک رپورٹ آئی ہے۔ یہ سرحد پار وِتی کے ضلعے کے ایک قصبے کا واقعہ ہے۔ میں مصلحتاً نام اور مقام چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ خودکشی کرنے والا مر چکا تھا۔ صرف کاغذی کارروائی کرنی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرانا تھا اور کیس ختم۔ تھانیداروں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قتل کو بھی خودکشی ثابت کر دیں اور تفتیش کے لمبے چکّر سے بچیں۔ میں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا کہ مرنے والا مر چکا ہے۔ تھوڑی دیر میں کارروائی مکمل ہو جائیگی۔

مَیں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اے۔ ایس۔ آئی سے کہو کہ موقعہ پر چلا جائے۔ اُس کا نام عثمان علی پٹھان تھا۔ رام پور کا رہنے والا یہ نوجوان اے۔ ایس۔ آئی بڑی شیطان چیز تھا لیکن مَیں نے اُسے لگام ڈال رکھی تھی۔ مجھے ابّا جان کہا کرتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ کمبخت عورتوں کا شیدائی تھا۔ رشوت عورت کی شکل میں لیا کرتا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا "خدا کی قسم، ایک پیسہ رشوت نہیں لی"۔ بہرحال لڑکا برخوردار تھا۔

کانسٹیبل چلا گیا۔ مَیں ناشتے سے فارغ ہُوا ہی تھا کہ عثمان آگیا۔ کہنے لگا — "ابّا جان! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، میں موقعہ پر چلا جاتا ہوں لیکن خودکشی کی یہ رپورٹ ایک پٹاخہ سی لڑکی لے کے آئی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے خاوند نے خودکشی کر لی ہے۔ میں گیا تو پھر آپ کہیں گے کہ تم تفتیش کی بجائے لڑکی میں دلچسپی لیتے ہو۔ آپ خود آجائیں"۔

مجھے غصہ تو آیا لیکن میری ہنسی نکل گئی۔ ایک ہی مہینہ پہلے چوری کی ایک واردات کی تفتیش میں عثمان نے ایک جوان لڑکی کو اپنے "دامِ محبت" میں پھانس لیا تھا۔ مجھے پتہ چلا تو مَیں نے عثمان کو اپنے گھر لاکر خوب پیٹا تھا۔ اُس وقت مَیں اُسے اپنا ماتحت افسر نہیں بلکہ بیٹا سمجھ رہا تھا اور وہ بھی مجھے اپنا باپ سمجھ رہا تھا۔ آج وہ لڑکا یاد آتا ہے تو میں آنسو روک نہیں سکتا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد وہ ڈاکوؤں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ اُس نے دراصل مجھے بچانے کے لیے جان دی تھی۔ یہ بڑا ہی لمبا واقعہ ہے۔ کسی وقت سُناؤں گا۔

"مجھے یہ لڑکی مشکوک طبیعت کی لگتی ہے" — عثمان نے کہا — "اُس کے ساتھ ایک جوان آدمی ہے۔ کہتی ہے کہ چچازاد بھائی ہے۔"

"مشکوک کیوں؟" — تم نے پوچھا۔

"اُس کے خاوند نے خودکشی کر لی ہے اور اُس کی آنکھیں خشک ہیں" — عثمان نے جواب دیا — "اس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ شکاری ہے۔ شکل دار بھی ہے۔ ذرا سی آنچ دکھاؤ تو پٹاخوں کی لڑی کی طرح پٹ پٹ بولنے لگتی ہے اور جو آدمی اس کے ساتھ ہے وہ یا تو ہوشیار ہے یا ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

مَیں عثمان کے ساتھ تھانے میں گیا تو تین اور آدمی یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ قبرستان کے باہر والے سرے پر پیپل کے ایک درخت کے ساتھ ایک لاش لٹک رہی ہے۔ گلے میں رسّے کا پھندا ہے۔ میرے دفتر میں ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو لڑکی سے ایک دو سال بڑا تھا۔ لڑکی

کی عمر بائیس تئیس سال تھی۔ عثمان ٹھیک کہتا تھا۔ لڑکی شکل دار تھی۔ جسم میں بھی کشش تھی اور صورت میں بھی۔ اس نے بتایا کہ صبح سویرے سویرے اس آدمی نے (جسے میں کہانی بیان کرنے کے لیے نادر کہوں گا) مجھے آکر بتایا کہ تمہارے خاوند کی لاش درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ آؤ تھانے میں رپورٹ درج کرا دیں — یہ مجھے تھانے میں لے آیا۔

"تم خاوند کی لاش دیکھ آئی ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "یہ (نادر) دیکھ آیا ہے۔ یہ جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔"

"تم نے لاش کس وقت دیکھی؟" — مَیں نے نادر سے پوچھا۔

"صبح سویرے محلے میں شور شرابا ہُوا کہ نوازش (مقتول) کی لاش پیپل سے لٹک رہی ہے" — اُس نے جواب دیا — "مَیں دَوڑتا گیا۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ لاش دیکھی۔ وہ نوازش کی ہی ہے جو اِس کا خاوند ہے" — میرے کسی سوال کے بغیر ہی اُس نے کہا — "اُس نے خودکشی کی ہے۔"

"تمہارا خیال بھی یہی ہے کہ تمہارے خاوند نے خودکشی کی ہے؟" — میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"جی ہاں" — اُس نے بلا جھجک جواب دیا — "خودکشی کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ وہ تو شریف آدمی تھا۔ کسی کے ساتھ اُس کی دشمنی نہیں تھی۔"

"تمہارے والد صاحب یا تمہارے خاوند کے والد صاحب رپورٹ کے لیے کیوں نہیں آئے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں اپنے خاوند کے ساتھ سب سے الگ رہتی تھی" — اُس نے جواب دیا اور اس کا چچازاد، نادر بول پڑا — "اُن سب پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ دونوں خاندان پیپل کے اِردگرد اپنے سینے پیٹ رہے ہیں اور عورتیں اپنے بال نوچ رہی ہیں۔ اُن بے چاروں کو تو ہوش ہی نہیں۔"

میں نے لڑکی کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس نے نہ بال نوچے تھے نہ سینہ پیٹا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنے سے آنسو بھی نہیں آئے تھے کہ رات کا کاجل ہی صاف کر دیتے۔ اگر میں چہرہ شناسی کی کچھ اہلیت رکھتا تھا تو میری یہ رائے غلط نہیں تھی کہ اس خوبصورت لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور گھبراہٹ کے پردے میں اطمینان کی جھلک بھی تھی۔

میں نے ان دونوں سے کوئی اور بات پوچھنے کی بجائے بناوٹی سی آہ بھری اور لڑکی سے کہا — "اس جوانی میں بیوہ ہو جانا کتنا بڑا حادثہ ہے، خودکشی کرنے والے نے یہ تو سوچا ہی نہیں۔ اللہ اُسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے" — ہمدردی کی دو چار باتیں کر کے انہیں یہ تاثر دیا کہ یہ واردات خودکشی کی ہی ہے۔ میں نے متعلقہ عملہ ساتھ لیا۔ ایک کانسٹیبل کو کھوجی کو موقعۂ واردات پر لانے کو دوڑایا اور پیپل کے اُس درخت تک پہنچا جس کے ایک ٹہن کے ساتھ لاش لٹک رہی تھی۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا لیکن وہ کچھ دہشت کی وجہ سے درخت سے دُور کھڑے رہے اور کچھ اس لیے بھی آگے نہ گئے کہ دو عقل مند قسم کے ہندوؤں نے انہیں یہ کہہ کر پیچھے رکھا تھا کہ پولیس آ کر کھُرے دیکھے گی۔ اس سے میرا کام

آسان ہو گیا۔ وہ علاقہ قبرستان کا تھا اور شہر سے باہر۔ اس کے ایک طرف آبادی تھی۔ باقی اطراف پر کھیت اور ویرانہ تھا۔ پیپل کا درخت بہت پُرانا تھا اور قبرستان کے ویران سِرے پر تھا۔ اس کے ساتھ ایک وسیع نشیب تھا جو بارشوں کے پانی سے تالاب بنا ہُوا تھا۔ اس سے پرے زمین اُونچی نیچی تھی۔ کھڈ نالے تھے۔ جگہ قبرستان کی وجہ سے ڈراؤنی سی تھی۔ شام کے بعد اُدھر کوئی وارداتیا ہی جا سکتا تھا۔ بہرحال رات کے وقت وہاں سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ رات کے وقت اس علاقے میں رہزنی، آبروریزی اور قتل کی واردات بے خوف و خطر کی جا سکتی تھی۔ اُس زمانے میں آبادیاں کم تھیں۔ قصبے اور شہر آج کی طرح اتنے زیادہ پھیلے ہوئے نہیں تھے۔ روزمرہ زندگی میں آج کی طرح افراتفری اور بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ اس قصبے کے بازار شام پڑتے ہی بند ہو جاتے اور لوگ جلدی سو جاتے تھے۔

پیپل کے پیڑ سے لٹکتی لاش

میں نے لاش کی کیفیت دیکھی۔ متوفی کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرے کا رنگ موت نے سفید کر دیا تھا لیکن زندگی میں یہ رنگ زرد تھا۔ چہرہ تندرست نہیں تھا۔ تقریباً تین انچ لمبی داڑھی تھی۔ منہ ذرا سا کھُلا ہُوا تھا۔ آنکھیں اتنی تھوڑی کھُلی ہُوئی تھیں کہ انہیں بند کہا جا سکتا تھا۔ گردن لمبی ہو گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جھٹکے سے ریڑھ کی ہڈی اور کھوپڑی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ پھانسی میں ایک تو سانس رُک جاتا ہے، دوسرے یہ ہوتا ہے

کہ ریڑھ کی ہڈی کا آخری حصہ جو کھوپڑی کے ساتھ ملا ہُوا ہوتا ہے الگ ہو جاتا ہے۔ اسے عام فہم زبان میں منکہ ٹوٹ جانا کہتے ہیں۔ اس سے مرنے والا مرنے سے پہلے ہی بے حِس ہو جاتا ہے۔ حِسیات کا انحصار اسی جوڑ پر ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے ٹہن پر جا کر رسّے کا ایک سِرا ٹہن کے ساتھ باندھا، دوسرا اپنی گردن سے باندھا اور ٹہن سے کُود پڑا، ورنہ گردن اتنی لمبی نہ ہوتی۔

میں قریب سے جان چھڑانے کے لیے اسے خودکُشی کی واردات کہہ سکتا تھا۔ تھانیدار اسی میں اپنی عافیت دیکھا کرتے ہیں لیکن خداوند تعالیٰ نے میرے ساتھ بے انصافی یہ کی ہے کہ مجھے تھانیداری کا رُتبہ تو عطا کر دیا مگر انسانوں والی حِسیں اور زیادہ تیز کر دیں اور ایک حِسِ فالتو میرے اندر ڈال دی اور جذبات ایسے دے دیئے جنہیں پولیس کی شعبدہ بازیاں مار نہ سکیں۔

"کیوں بیٹا، کیا خیال ہے؟" — میں نے عثمان سے پوچھا۔

"لعنت بھیجو ملک ابّا! لکھو خودکشی" — اُس نے جواب دیا، اور متوفی کی بیوی کی طرف دیکھا جو پرے کھڑی تھی۔ عثمان نے کہا — "ہاں، ذرا چکر بازی ہو جائے تو گُھٹلیوں کے بھی دام مل جائیں گی۔"

"بندر کی اولاد" — میں نے کہا — "ذرا لاش کو دیکھ۔ کیا یہ خودکُشی ہے؟" میں لڑکے کو ٹریننگ بھی دینا چاہتا تھا۔

"اوں ہوں" — اُس نے جواب دیا — "مار کر لٹکایا گیا ہے۔ کپڑوں پر خون ہے۔ گھاس کے نشان اور مٹی بھی ہے۔"

"اور آنکھیں بھی بند ہیں، مُنہ بھی بند ہے" — میں نے اُسے بتایا — "گردن کو اتنا شدید جھٹکا لگا ہے کہ اس کی لمبائی دیکھو مگر آنکھیں اور مُنہ بند رہا۔ ہو نہیں سکتا۔"

پھانسی سے مُنہ کھل جاتا ہے۔ بعض افراد کے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے کہ زبان باہر آ جاتی ہے اور دانت اسے درمیان میں سے شکنجے کی طرح پکڑ لیتے ہیں۔ آنکھیں اس طرح کھُل جاتی ہیں کہ ڈھیلے باہر آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس لاش کے کپڑوں پر خون تھا۔ اُس نے پاجامہ اور کُرتہ پہن رکھا تھا۔ دائیں بازو سے، کُہنی کے نیچے سے خون نکلا تھا۔ کپڑوں پر خون کے دھبّے تھے۔ پاجامے پر گھاس کے سبز نشان تھے اور مٹی بھی تھی۔ پیٹھ پر کُرتہ گھاس اور مٹی کے گہرے نشان لیے ہُوئے تھا۔ متوفی کا جسم لاغر سا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چمڑے کے ہلکے سے چپل تھے جو اُترے نہیں تھے کیونکہ ٹخنے کے پیچھے سے سٹریپ سے بندھے ہُوئے تھے۔ اُس کی دونوں مُٹھیاں بند تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرنے والا چپل سمیت درخت پر چڑھا۔ وہ درخت پر چڑھ کر ہی اپنے آپ کو پھانسی دے سکتا تھا۔ لاش کے پاؤں زمین سے کم و بیش دس فٹ اُوپر تھے۔

میں نے اُس کی چپل کے تلوے دیکھے اور پیپل کے تنے کے اِرد گرد جہاں سے اُوپر چڑھا جا سکتا تھا زمین دیکھی۔ کچھ روز پہلے دو بار بارش برس چکی تھی۔ زمین نرم تھی۔ کُھرے (پاؤں کے نشان) صاف تھے مگر ان میں ایک بھی نشان مرنے والے کے پاؤں کا نہیں تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مرنے والا سیڑھی لگا کر یا رسّہ کمند کی طرح اتنے اُونچے ٹہن پر پھینک کر چڑھا ہو۔ ٹہن کی بلندی کا حساب کریں۔

متوفی کے پاؤں زمین سے دس فٹ اُوپر تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ یا دس انچ تھا۔ ٹھن سے اُس کی گردن تک رسّے کی لمبائی کم و بیش سات فٹ تھی۔

لہٰذا بلا شک و شبہ کہا جا سکتا تھا کہ متوفی خود اُوپر گیا یا اُسے اُوپر لے جایا گیا۔ کھُرے بتاتے تھے کہ اُسے اوپر لے جایا گیا کیونکہ وہاں متوفی کے کھُرے کی بجائے کسی اور آدمی کا کھُرا تھا۔

مَیں تماشائیوں کو دیکھنے لگا۔ متوفی کے خاندان کے افراد، خصوصاً عورتوں نے بڑی ہی دلخراش آہ و بکا بپا کر رکھی تھی۔ اس کی دو بہنیں تھیں اور ماں۔ انہوں نے اپنے بال نوچ نوچ کر اور منہ پر ہاتھ مار مار کر اپنا حُلیہ بُری طرح بگاڑ رکھا تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ مَیں نے کانسٹیبلوں سے کہہ کر اس سارے ہجوم کو وہاں سے اتنی دُور ہٹا دیا جہاں سے وہ میری کارروائی نہ دیکھ سکیں۔ ہو سکتا تھا یہ واقعی قتل کی واردات ہو اور ملزم تماشائیوں میں موجود ہُوں۔ کانسٹیبل تماشائیوں کو قبرستان کے دوسرے سرے پر لے گئے۔

اتنے میں کھوجی آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کی ماں اور بیوی بھی ساتھ تھیں۔ کھوجی ادھیڑ عمر مسلمان تھا۔ اُس کی ماں بہت بُوڑھی تھی۔ یہ کُنبہ بیکانیر کے علاقے کے ایک مشہور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ صحرائی کھوج کے تو یہ لوگ ماہر تھے، اُنہوں نے شہری کھوج اور پولیس کے تفتیشی کھوج کی بھی ٹریننگ حاصل کر لی تھی۔ کھوجی نے اپنی ماں کے متعلق مجھے بتایا کہ تین چار دن ہوئے وہ اُن سے ملنے آئی تھی۔ اُسے کھُرے پہچاننے اور اُٹھانے کی ٹریننگ ماں نے ہی دی تھی۔ اُس وقت اُس کھوجی کی عمر آٹھ نو سال تھی۔ اُس کا باپ ماہر کھوجی تھا۔ کھوجی چودہ سال کا تھا جب اُس کا

باپ مر گیا تھا۔ کھوجی کی بیوی بھی اس فن سے واقف تھی۔ کانسٹیبل اسے گھر سے بلا لے گیا اور واردات بتائی تو اس کی ماں بھی شوقیہ ساتھ چل پڑی۔ اس کے ساتھ بیوی بھی آ گئی۔

اس سے پہلے سُنائی ہوئی کہانیوں میں میں آپ کو کھوجیوں کے متعلق بتا چکا ہوں کہ اپنے فن سے کس طرح حیران کر دیتے تھے۔ پاکستان میں ایسے کھوجی اب بھی موجود ہیں جو مُلزموں کو زمین کی تہوں سے نکال سکتے ہیں اور مٹی میں دبے ہُوئے کھُرے پہچان کر مُلزموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں مگر یہاں انہیں کوئی اہمیّت نہیں دی گئی۔ لہٰذا اتنا اہم فن مرتا جا رہا ہے۔

مَیں نے کھوجی کو لاش دکھائی جو ابھی تک رسّے سے لٹک رہی تھی اور بتایا کہ یہ واردات خودکُشی کی نہیں قتل کی ہے اور یہ بھی بتایا کہ مرنے والا اپنے پاؤں چل کر نہیں آیا۔ کھوجی کی ماں نے لاش کے نیچے جا کر اُس کے چپل کے تلوے دیکھے۔ کھوجی نے بھی دیکھے۔ اُس کی بیوی نے بھی دیکھے۔ میں عثمان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ موضوع یہی واردات تھی۔ کھوجی بلکہ کھوجیوں نے میری طرح تنے کے اِرد گرد کھُرے دیکھے۔

"قتل کر کے لٹکایا گیا ہے"— ماں نے مجھے کہا۔

وہ تینوں زمین پر جُھکے جُھکے ایک طرف چلنے لگے اور اُس وسیع نشیب میں اُتر گئے جہاں تالاب تھا۔ کنارے نم آلود تھے۔ کچھ جگہ خشک بھی تھی اور ذرا الگ ہٹ کر مٹی کی قدرتی دیوار کھڑی تھی۔ وہ تینوں تالاب کے کنارے کنارے گئے اور بہت آگے جا کر تینوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر جوڑ لیے اور نیچے کو کر لیے تین

چار منٹ بعد کھوجی نے مجھے بُلایا۔ میں دوڑ کر پہنچا۔ وہاں پاؤں کے نشان تھے۔

"ایک عورت بھی ساتھ ہے"۔۔۔ کھوجی کی ماں نے کہا۔۔۔ "وہ یہاں تک ساتھ آئی ہے اور واپس چلی گئی ہے۔ مرد پر بوجھ ہے۔ بوجھ لاش کا ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ آگے چلو۔"

وہ تینوں سنبھل سنبھل کر آگے چلنے لگے۔ بعض کھُرے مجھے بھی نظر آئے مگر میں انہیں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔

"مرد آگے ہے"۔۔۔ ماں نے رُک کر کہا۔۔۔ "اُس سے اچھی طرح چلا نہیں جاتا۔ عورت پیچھے ہے۔ اُس کی چال بھی صحیح نہیں"۔۔۔ آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ کھوجی کی ماں نے کہا۔۔۔ "عورت کی عمر تیس سال سے کم ہے۔۔۔۔ شادی شدہ ہے۔ اس کی چال ایسی نہیں جیسی اُس بیوی کی ہوتی ہے جو پیدل سفر میں اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے ہنسی خوشی چلتی ہے۔ یہ مجرم اور گناہگار عورت کے قدم ہیں۔ اس کے قدم اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں اُٹھ رہے۔ یہاں مرد رُک گیا ہے۔ عورت اُس کے دائیں طرف آکر کھڑی ہو گئی ہے"۔۔۔ کھوجی نے ایک طرف زمین پر دیکھ کر کہا۔۔۔ "یہ بھی دیکھتے چلو۔ وہ واپس جا رہی ہے۔"

کھُرے ہمیں نشیب سے نکال کر اُوپر لے گئے۔ وہاں جگہ پکی تھی اور اس پر نوکدار کنکریاں تھیں۔ کوئی کھُرا واضح نہیں تھا۔ کھوجیوں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اِس طرح دیکھا جیسے زمین کو سُونگھ رہے ہوں۔ کھوجی کی ماں نے کنکریوں کو دیکھ کر رُخ کا تعیّن کیا اور کہا۔۔۔ "اِدھر سے آئے ہیں"۔۔۔ پندرہ سولہ قدم آگے زمین نرم آگئی جہاں کھُرے اور زیادہ واضح تھے۔ ایک جگہ ماں رُک کر بیٹھ گئی تھوڑی سی

مٹی اُٹھا کر ہتھیلی پر پھیلائی اور اُسے انگلیوں سے پھیلا پھیلا کر سُونگھا۔ کہنے لگی۔۔۔ "یہ آدمی زخمی ہے یا یہ مقتول کا خون ہے"۔

میں نے مٹی سُونگھی تو لُوخون کی تھی۔ چھوٹا سا قطرہ وہاں گرا تھا جو خشک ہو چکا تھا۔ میں نے یہ مٹی اپنے رومال کے کونے میں باندھ لی، اور ماں سے کہا کہ مجھے ایسی مزید مٹی کی ضرورت ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی عثمان سے کہا کہ وہ اِن دو کھُروں کے مولڈ تیار کرا لے۔ وہ وہیں سے چلا گیا۔ میں کھوجیوں کے ساتھ آگے گیا۔ کچھ جگہ کچی تھی۔ ساون کی وجہ سے رات اوس پڑی تھی جس سے کھُرے اور زیادہ صاف ہو گئے تھے۔

"عورت کی چال بالکل قدرتی نہیں"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔ "مرد پر لاش کا بوجھ ہے۔ عورت اُس کا بوجھ صحیح کر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں نے قتل کیا ہے"۔

کھڈ میں ایک عورت، دو آدمی

دس بارہ قدم آگے جا کر کھُرے ہمیں ایک کھڈ میں اُتار لے گئے۔ کھڈ آٹھ دس فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ گہرائی اتنی کہ اس میں درمیانہ قد کا آدمی کھڑا ہو جائے تو چھُپ جاتا تھا۔ کنارے پر جھاڑیاں تھیں۔ کھڈ کے اندر ہری گھاس اُگی ہُوئی تھی۔ کناروں کے ساتھ بھی گھاس تھی۔ یہ گھاس جو نیچے تھی اور کناروں کے ساتھ تھی وہ گھنی نہیں تھی۔ پھر بھی گھاس نے کہانی بیان کر دی۔ تہ کی گھاس جگہ جگہ

سے دبی مسلی ہوئی تھی۔ جو کچھ ہوا اسی کھڈ میں ہوا تھا۔ کھوجی، اُس کی ماں اور بیوی کھڈ کے باہر زمین کو دیکھ دیکھ کر گھومنے لگیں۔

"یہ کھرا لاش کا ہے" ___ کھوجی نے کہا اور وہ ایک طرف چل پڑا۔ ایک جگہ رُک کر کہنے لگا ___ "یہ تو ان کے ساتھ آ رہا ہے ․․․․ اب یہ کھرا دیکھیں۔ یہ اُس کا ہے جو لاش اُٹھا کر پیپل تک گیا ہے۔ اس پر کوئی وزن نہیں"

بوڑھی ماں نے چند قدم دُور تک جا کر دیکھا اور واپس آ کر کہا ___ "یہاں عورت اپنی اصل چال چل رہی ہے۔ قدموں کی لمبائی ایک جیسی ہے۔ دو آدمی ساتھ ہیں۔ تینوں آگے پیچھے چل رہے ہیں"

میں کچھ دُور تک کھرے دیکھتا گیا۔ بعض صاف تھے، بعض ایک دُوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ صرف دو جگہوں پر میں نے مقتول کے چپل کا کھرا دیکھا۔ ماں بھی میرے پاس آ گئی اور مجھے کچھ اور آگے لے گئی۔ ایک جگہ کھرے بالکل ہی واضح نہیں تھے کیونکہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے اور وہاں سے مٹی ہٹی ہوئی تھی۔

کھوجی کی ماں نے مجھ سے پوچھا "کچھ سمجھے؟" ___ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ اُس نے آنکھ مار کر اور مسکرا کر کہا ___ "تم تھانے کے نہیں، فیل خانے کے داروغہ معلوم ہوتے ہو" ___ ستّر بہتّر سال کی بڑھیا کا یہ مذاق مجھے بہت ہی پسند آیا۔ اُس نے رازداری سے کہا ___ "وہ اسے کھڈ میں لے جا رہا تھا۔ یہاں وہ بے قابو ہو گیا اور عورت کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ دوسرا آدمی رُکا نہیں۔ اُس نے کہا ہو گا ___ "ارے یہاں ٹھیک نہیں۔ آگے چلو" ․․․․

یہ سب عورت کا چکر ہے"

یہ واضح ہو گیا کہ مقتول کھڈ تک ایک عورت اور ایک آدمی کے ساتھ آیا۔ بہرحال یہ بالکل واضح ہو گیا تھا کہ یہ قتل کی واردات ہے ․․․․ یہ تینوں قصبے سے آئے اور قبرستان کے پہلو سے گزرے۔ ہم واپس گئے تو کھڈ کے اندر میں اکیلا گیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ کوئی کام کی چیز مل جائے۔ کام کی دو چیزیں ملیں۔ ایک چاقو تھا جو جرائم پیشہ لوگوں والا بڑا چاقو نہیں بلکہ عام قسم کا گھریلو چاقو تھا۔ اس کا بلیڈ نوکدار تھا۔ یہ چاقو گھاس میں سے اس حالت میں برآمد ہوا کہ اس کا دستہ مٹی میں دبا ہوا تھا۔ بلیڈ کا پچھلا حصّہ بھی مٹی میں تھا۔ نوک باہر تھی اور نوک پر اتنا سا خون جما ہوا تھا جو عام آدمی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

بہت ہی غور سے دیکھنے سے کام کی ایک چیز اور مل گئی۔ یہ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا تھا جس کی لمبائی تقریباً نصف انچ تھی۔ مزید ٹکڑوں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ کُل چھ ٹکڑے ملے۔ تین نصف انچ سے بھی چھوٹے تھے اور باقی ذرا بڑے۔ یہ سب مٹی میں دبے ہوئے تھے۔ چاقو اور چوڑیوں کے ٹکڑے مٹی میں دبے ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں لڑائی ہوئی ہو گی اور یہ چیزیں پاؤں تلے آ کے نرم مٹی میں دب گئیں۔ چاقو کے دستے پر اُنگلیوں کے نشان مٹ گئے تھے۔

کھوجیوں کو نیچے بُلایا۔ انہوں نے بہت غور سے دیکھا۔ کوئی واضح کھرا نظر نہ آیا۔ انہوں نے زمین اور گھاس کو کئی جگہوں سے سُونگھا۔ ماں نے رائے دی کہ یہاں ایک عورت پر دو مردوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ چاقو کی نوک بتا رہی تھی کہ کسی کو چاقو لگا ہے۔ پیپل سے لٹکتی لاش کے کپڑوں پر خون تھا۔

وہاں سے دو کھُرے باہر نکلے۔ ایک تو عورت کا تھا اور دوسرا آدمی کا۔ کھڈ کے کنارے عمودی نہیں ڈھلانی تھے۔ ایک طرف سے آسانی سے اُترا اور چڑھا جا سکتا تھا۔ وہاں کھوجی کی بیوی نے غور سے دیکھ کر کہا کہ اس آدمی کی پیٹھ یا کندھوں پر لاش ہے اور وہ ہاتھ کھڈ کی ڈھلان پر رکھ رکھ کر اُوپر چڑھا ہے۔ عورت اس کے پیچھے باہر نکلی ہے۔ باہر نکلنے والے کھُروں میں مقتول کا کھُرا نہیں تھا۔ وہ کھڈ میں زندہ داخل ہُوا اور یہاں سے اُس کی لاش نکلی۔ مرنے والا تو مر گیا تھا۔ مجھے اب مسلی ہُوئی گھاس، ٹوٹی ہُوئی چُوڑیوں اور مٹی سے یہ راز معلوم کرنا تھا کہ وہ عورت کون تھی جس نے اپنی عصمت دو مردوں کے درمیان رات کی تاریکی میں اس کھڈ میں لا رکھی اور انہیں بھیڑیئے بنا دیا تھا اور مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون تھا جو لاش کو کھڈ سے پیپل تک لے گیا۔ میرے ذہن میں یہ ارادہ آیا ــــ "عثمان کی بات مان لو۔ لکھ دو خودکشی۔"

"نہ احمد یار خان" ــــ میرے ضمیر نے مجھے روک دیا ــــ "اگر تم نے اس عورت اور اس آدمی کو پکڑ کر اسی طرح نہ لٹکایا جس طرح پیپل کے ساتھ لاش لٹک رہی ہے تو کل پرسوں ایک اور خاوند کی لاش کہیں لٹکی ہُوئی ہو گی۔"

میرا دھیان فوراً مقتول کی بیوی اور اُس کے چچا زاد، نادر کی طرف گیا جنہوں نے تھانے رپورٹ درج کرائی اور کہا تھا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے۔ میرے پاس چُوڑی یا چُوڑیوں کے لال ٹکڑے تھے اور کھُرے۔ چاقو تو کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ مقتول کا بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال میرا تھانیداری تجربہ بتا رہا تھا کہ بیوی نے آشنا کے ساتھ مِل کر خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کرایا ہے کہ خودکشی کی واردات لگے۔

میں نے مقتول کی بیوی اور نادر کو مشتبہ افراد میں شامل کر لیا۔

اُسے خاوند کی موت کا غم نہ تھا

میں لاش دیکھنے گیا۔ تماشائیوں میں سے دو معزز قسم کے آدمی، ایک ہندو اور ایک مسلمان بلائے۔ کاغذی کارروائی کی تصدیق کے لیے انہیں ساتھ رکھا۔ درخت پر میں خود چڑھا کیونکہ میں اُوپر بھی کوئی سُراغ دیکھنا چاہتا تھا۔ چڑھنا مشکل نہیں تھا۔ بہت پُرانا درخت تھا۔ تنا چوڑا ہو کر زمین سے دو تین گز اُوپر جا کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ٹہن موٹے تھے۔ اُونچے نہیں تھے۔ میں تنے اور اس کی کھوہ میں غور سے دیکھتا اُوپر چلا گیا۔ چار پانچ آدمیوں کو نیچے کھڑا کیا۔ اُوپر سے رسّہ کھولا اور لاش آہستہ آہستہ نیچے جانے لگی۔ چارپائی آ گئی تھی۔ لاش اس پر ڈال دی گئی۔

نیچے آ کر میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ اُس کے دائیں بازو سے خون بہتا رہا تھا جو جم گیا تھا۔ کُرتے کی آستین وہاں چپک گئی تھی۔ میں نے آستین ہٹا کر زخم دیکھنے کی کوشش نہ کی کیونکہ پوسٹ مارٹم سے پہلے لاش کی حالت میں کوئی ردّوبدل نہیں کرنا تھا۔ لاش کی مُٹھیاں بند ہو کر اکڑ گئی تھیں۔ میں نے ایک مُٹھی کھولنے کی کوشش کی لیکن کھُل نہ سکی۔ میں نے زیادہ زور نہیں دیا۔ کُرتہ اور پاجامہ ہٹا کر جسم دیکھا۔ بازو کے علاوہ اور کہیں چوٹ یا زخم نہیں تھا۔ گلے سے رسّہ اُتار کر دیکھا۔ وہاں رسّے کا کوئی نشان نہ تھا۔ البتہ ہاتھوں سے ہلاک کرنے کے نشان صاف تھے۔ میں نے ایسے کئی مقتول دیکھے تھے۔ پھانسی سے مرے ہُوئے انسان کی گردن پر نشان اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مقتول کو قتل کر کے اس کے گلے میں رسّہ

ڈالا گیا تھا۔ اُس وقت تک خون کی حرکت رُک چکی تھی۔ کُرتے اور پاجامے پر خون کے دھبّے تھے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی اور ساتھ ایک سوالنامہ سا بھی بھیجا۔ میں نے سول سرجن کے نام چٹھی میں لکھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ مقتول کے کپڑوں پر اُس کا اپنا خون ہے یا کسی دوسرے انسان کا بھی ہے۔ موت کا وقت ضرور لکھا جائے اور اس طرح کی چند اور باتیں پُوچھیں جو عام طور پر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شامل نہیں کی جاتیں۔ پوسٹ مارٹم ڈاکٹروں کا معمول ہوتا ہے جو وہ معمول کے مطابق ہی کرتے ہیں۔

قصبے میں پوسٹ مارٹم کا انتظام تھا لیکن مرے ہُوئے انسان کے خون اور خشک خون کے ٹیسٹ کا انتظام پچاس میل دُور کے شہر میں تھا۔ خون جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کا گروپ تو معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی دیگر تفصیلات معلوم کرنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ خشک ہوتے ہی BLOOD CELLS مر جاتے ہیں۔ گروپ معلوم ہو جانے سے ملزم پر شک ذرا پختہ ہو سکتا ہے لیکن مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی گروپ کا خون بے شمار لوگوں میں ہو سکتا ہے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہہ کر مخبروں کو چوکنا کر دیا۔ میرے مخبروں میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ابتدائی تفتیش کے لیے میں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ سب سے پہلے مقتول کی بیوی کو بُلایا۔ اپنے عملے کو وہاں سے ہٹا دیا۔ میں پیپل کی موٹی سی جڑ پر بیٹھ گیا جو زمین سے ڈیڑھ ایک فٹ اُوپر تھی۔ میں نے اس جوان لڑکی کو بڑی غور سے دیکھا اور اُسے کہا ــــ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ مجھ سے

گھبرانا نہ لوگوں کی باتوں سے۔ تمہارے خاوند نے خودکُشی کر لی ہے۔ کسی کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ خاموشی سے سُنتی رہنا۔"

اُس نے جب میرے مُنہ سے خودکشی کا لفظ سُنا تو اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر آئی اور گزر گئی۔ چند اور ہمدردانہ باتوں سے میں نے اس کی گھبراہٹ ختم کر دی اور اس کی کلائیوں کو دیکھا۔ اس کی دونوں کلائیوں میں بالکل اُسی رنگ اور اُس قسم کی چُوڑیاں تھیں جس قسم کی چُوڑیوں کے ٹکڑے مجھے کھڈ میں سے ملے تھے۔

میں ان کے متعلق اُس سے ابھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک کلائی میں تین اور دوسری میں پانچ چوڑیاں تھیں۔

"تم نے اتنے اعتماد سے یہ کیوں کہہ دیا تھا کہ تمہارے خاوند نے خودکُشی کی ہے؟ کیا وہ تمہیں بتا کر گیا تھا یا اُس نے اس سے پہلے کبھی خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟"

"وہ پریشان رہتا تھا" ــــ اُس نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔ ایسے سوال کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔

"پریشانی کیا تھی؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"اُس کی عادت ہی کچھ ایسی تھی" ــــ اُس نے کہا ــــ "چُپ چُپ رہتا تھا۔ اُس کی بڑی بہن شادی شدہ ہے۔ اُس کے خاوند کو دو سال سے دِق کا مرض لگا ہُوا ہے۔ اب تو بے چارہ ختم ہونے والا ہے۔ میرے خاوند کو بہن کا بھی غم تھا۔"

"خاوند کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟"

اُس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا ــــ "جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں۔"

"رات کو وہ گھر سے کس وقت نکلا تھا؟"

"کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد باہر گیا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ تیزی سے باورچی خانے میں گیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔"

"تم پریشان نہیں ہوئیں کہ وہ اتنی تیزی سے آیا اور باہر نکل گیا؟"

وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی۔ میں ابھی اُسے صرف بھانپنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اُسے خاوند کے مرنے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اس کا یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کا خاوند باہر گیا، آیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ بہرحال میں نے اُسے محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ مشتبہ نمبر ایک ہے۔ اُسے تسلی دلاسے دے کر یہ کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میں نے اُس سے کیا پوچھا ہے۔ پھر اُسے رخصت کر دیا اور اُس کے چچازاد کو بُلایا جس کے اصلی نام کی جگہ میں فرضی نام نادر استعمال کر رہا ہوں۔ اُس سے پوچھا کہ اُسے کس وقت پتہ چلا تھا کہ اس آدمی کی لاش درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ابھی بہت سویرا تھی۔

"کس سے پتہ چلا تھا؟"

"باہر گلی میں لوگ باتیں کر رہے تھے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں اپنے گھر والوں کے ساتھ باہر نکلا تو یہ خبر سُنی۔ میں دوڑتا یہاں آیا اور لاش دیکھ کر اس کی بیوی کو جا بتایا۔"

"بیوی کیا کر رہی تھی؟"

"سوئی ہوئی تھی۔"

"تم نے دروازہ کھٹکھٹایا ہوگا؟"

"میں اندر چلا گیا تھا" ــــ اُس نے گھبرا کر کہا اور فوراً بولا ــــ "نہیں.... دروازہ کھٹکھٹایا تھا" ــــ وہ چُپ ہو گیا اور سوچ کر بولا ــــ "دروازہ تو کھُلا تھا۔"

"گھر میں اور کون تھا؟"

"یہ لڑکی اکیلی تھی" ــــ اُس نے انکشاف کیا ــــ "لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ مقتول کے والدین الگ اپنے مکان میں رہتے ہیں۔"

"تم نے متوفی کی بیوی کو بتانے کی بجائے متوفی کے گھر والوں کو کیوں نہ بتایا اور اُس کے باپ کو کیوں نہ ساتھ لے کے تھانے میں آئے؟ بیوی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ ہِل گیا۔ اُس نے جواب دیا مگر اس کی عقل اور زبان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اُسے بڑی گہری نظر سے دیکھا اور اُسے بھی یہ تاثر دیا کہ اُس نے اچھا کیا کہ متوفی کی بیوی کو جا کر اطلاع دی اور اس کی راہنمائی کر کے اُسے تھانے لے آیا۔ اُسے شاباش دی۔ اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُسے میں نے رخصت کر دیا اور کھوجی کو بُلایا۔ اُسے مقتول کی بیوی اور نادر کے کُھرے دکھائے۔ اُس نے غور سے دیکھے۔ اپنی بیوی اور ماں کو بُلایا۔ لڑکی کے کُھرے کے متعلق تینوں نے رائے دی کہ پاؤں کا سائز ملتا ہے۔ جُوتی بدلی ہوئی ہے۔ نادر کے کُھرے کے متعلق بھی انہوں نے یہی رائے دی۔ بہرحال ان دونوں پر میرا شک پکّا ہو گیا۔

مقتول کے والدین کے بیان ضروری تھے۔ اُس کی ماں کو بُلانا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ ماں ہے اور اس وقت اُس کے جذبات بُری طرح بھڑکے ہُوئے ہیں، کوئی کام کی بات نہیں کر سکے گی۔ پھر یہ سوچ کر اُسے بُلا لیا کہ بھڑکے ہُوئے جذبات میں اُس کے مُنہ سے ایسی باتیں بھی نکل آئیں گی جو نارمل حالت میں نہیں کہی جاتیں۔ مقتول کی دو بہنیں بھی تھیں۔ انہیں بلانا ضروری نہیں تھا۔ مقتول کے باپ کو اور اس کی ماں کو بُلایا۔ ماں نے تو مجھے بھی ہلا کے رکھ دیا۔ اُس کا جوان بیٹا مارا گیا تھا۔ اُس کے خاوند نے تحمل سے میرے سوالوں کے جواب دیئے۔ ماں نے مقتول کی بیوی کو اپنے بیٹے کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی۔

ان کے ساتھ میں نے دو گھنٹے صرف کیے اور جو معلومات حاصل ہوئیں وہ مختصر الفاظ میں یہ تھیں کہ ساڑھے تین سال گزرے مقتول کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہُوئی تھی۔ یہ لوگ اپنے مکان میں رہتے تھے جو خاصا کشادہ تھا مگر لڑکی نے سُسرال کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی۔ مقتول بھلا مانس آدمی تھا۔ اس کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا جس کا ثبوت اس کی داڑھی تھی۔ یہ گھرانہ غریب اور متوسط درجے کے درمیان کا تھا۔ مقتول قصبے میں چھوٹے سے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ یہ ایک ہندو کا کارخانہ تھا جس میں لکڑی کے کھلونے، ٹیبل اور فلور لیمپوں کے سٹینڈ بنتے تھے۔

خاوند مسکین، لڑکی شوقین

لڑکی نے سُسرال کے خلاف اپنے خاوند کے کان بھرنے شروع کر دیئے

وہ بے چارہ اُس کی مان لیتا اور جب اُسے ماں اور بہنوں سے اس کے جواب میں باتیں معلوم ہوتیں تو وہ پریشان ہو جاتا۔ مقتول کی بیوی دراصل چاہتی یہ تھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ الگ مکان میں رہے۔ خاوند اور اُس کے گھر والوں کے لیے یہ صورت مالی لحاظ سے نقصان دہ تھی۔ مکان کا کرایہ الگ تھا، مگر بیوی ایسے حالات پیدا کرتی جا رہی تھی کہ خاوند کے والدین اُسے الگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

نادر اس لڑکی کے چچا کا بیٹا تھا۔ یہ گھرانہ صحیح معنوں میں امیر تھا۔ نادر دو بہنوں میں اکلوتا لڑکا تھا۔ والدین نے لاڈ پیار سے اُسے بہت سر چڑھا لیا تھا۔ وہ مقتول کی بیوی کے رشتے کا خواہشمند تھا۔ اُن کا آپس میں میل جول بھی تھا جس کے متعلق لوگ باتیں بھی کرتے تھے لیکن نادر کے والدین اس لڑکی کا رشتہ صرف اس لیے قبول نہیں کرتے تھے کہ لڑکی غریب گھرانے کی تھی اور یہ گھرانہ ان کی شان و شوکت کے مطابق جہیز دینے کے قابل نہیں تھا۔ دو سگے بھائیوں میں امیری اور غریبی کی دیوار کھڑی تھی۔ ان کی اولاد اسی تفریق کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لڑکے کے لیے تو جاگیرداروں اور تاجروں کی بیٹیوں کے رشتوں کے پیغام آ رہے تھے مگر یہ لڑکا اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی ضد کر رہا تھا۔ یہ ساری ایک ہی ذات برادری تھی۔ مقتول کے والدین نے لوگوں کی زبانی سُنا تھا کہ نادر لڑکی سے ملتا جُلتا ہے، اس لیے وہ اس لڑکی کا رشتہ مانگنے سے جھجکتے تھے۔

ایک روز نادر کے باپ نے مقتول کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے لڑکے کا رشتہ اس لڑکی سے کرا دے۔ بلکہ اُسی نے رشتہ طے کرا دیا اور مقتول کے والدین کو تسلی دی کہ لڑکی خراب نہیں۔ نادر اور وہ بہن بھائی ہیں۔ اُن کا

پیار پاک اور صاف ہے۔ چنانچہ لڑکی کو مقتول کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ نادر کے والدین خوش تھے کہ جس لڑکی کو وہ چاہتا ہے وہ بیاہی گئی ہے اور اب وہ اُن کی پسند اور مرضی کا رشتہ قبول کرے گا مگر اُس نے کوئی رشتہ قبول نہ کیا۔ اس کی بجائے وہ اسی لڑکی کے پیچھے پڑا رہا مگر سسرال میں وہ لڑکی سے کھلے بندوں نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ لڑکی خاوند کے ساتھ الگ رہے آخر اُس نے خاوند کو الگ کر لیا اور نادر نے انہیں اپنا چھوٹا سا ایک مکان خالی کرا دیا۔ یہ مکان ان سب کے گھروں سے دُور تھا اور کرائے پر چڑھا ہوا تھا نادر نے یہ مکان مقتول کو صرف چار روپے ماہوار کرائے پر دے دیا۔ اُس زمانے میں مکانوں کے کرائے بہت کم ہوتے تھے۔ مکانوں کے مالک کرایہ داروں کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ آج شہر میں جس مکان کا کرایہ ایک سو روپے ہوتا ہے وہ اُس دور میں پانچ روپے سے مِل جاتا تھا۔

مقتول اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں چلا گیا تو نادر وہاں کھلے بندوں جانے لگا۔ اکثر لوگ بتاتے تھے کہ مقتول کارخانے چلا جاتا تھا تو نادر اُس کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ مقتول آدھی تنخواہ والدین کو دے دیتا تھا۔ اس پر اُس کی بیوی نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ یہ لڑکی بعض اوقات اپنے ہاتھوں اپنی ساس کو پیسے دے آتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر لڑکی کو چوری چھپے پیسے دیتا تھا۔ مقتول کے والدین کے بیان کے مطابق چھ سات ماہ بعد مقتول پریشان رہنے لگا۔ وہ نادر کا گھر میں آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک سال بعد میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ لڑکی ایک بار میکے

گئی تو مقتول نے اُس کے والدین سے کہہ دیا کہ وہ اُسے اپنے گھر نہیں لائے گا۔ سمجھوتہ کرایا گیا۔ اُدھر نادر نے شادی سے انکار کر دیا۔ وہ ماں باپ کا لاڈ سے بگڑا ہُوا بچہ تھا۔ اُس کا گھرانہ امیر اور اثر و رسوخ والا بھی تھا۔ برادری پر اس گھرانے کا دبدبہ تھا۔ ایک بار مقتول نے نادر کے باپ سے شکایت کی کہ اُس کا بیٹا اُسے بدنام کر رہا ہے۔ باپ نے اُلٹا مقتول کو ڈانٹ دیا۔

دو سال گزرے تو مقتول نے والدین سے کہا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ والدین نے اُسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس میں اپنی بے عزتی ہے۔ برادری میں مخالفت پیدا ہو جائے گی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ حق مہر پانچ ہزار روپیہ لکھا گیا تھا اور بیس روپے ماہوار خرچ تھا۔ مقتول کے گھرانے میں اتنی رقم ادا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی بجائے انہوں نے اُسے مشورہ دیا کہ بیوی کے بڑے بھائی سے بات کرو۔ اس لڑکی کا یہ بڑا بھائی بدمعاشی میں قدم رکھتا تھا۔ رکھ رکھاؤ والا بھی تھا اور جُوا بھی کھیلتا تھا۔ چرس بھی پیتا تھا۔ گھر میں اُس نے ایک گائے اور ایک بھینس رکھی ہوئی تھی۔ محلے والے اس سے دُودھ بھی لیتے تھے۔ اُس کی عادتیں اچھی نہیں تھیں لیکن آدمی اچھا تھا۔ مقتول نے ایک روز ڈرتے جھجکتے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن کے تعلقات نادر کے ساتھ اچھے نہیں اور اگر وہ باز نہ آئی تو مقتول اُسے طلاق دے دے گا۔

لڑکی کے بھائی نے اُسی وقت مقتول کے ساتھ اُس کے گھر جا کر اپنی بہن (مقتول کی بیوی) کو اس قدر پیٹا کہ دو روز تو وہ گھر کا کام کاج بھی نہ کر سکی۔ مقتول نے اپنے والدین کو یہ سارا واقعہ سُنایا تھا۔ اُس کی بیوی کے بھائی نے اُس کی بیوی سے

کہا تھا — "اتنا نیک خاوند، اور تم اس کی داڑھی کو داغدار کر رہی ہو۔ اس کے پاؤں میں سر رکھو" — اور لڑکی نے مقتول کے پاؤں میں سر رکھ دیا تھا۔

چند دنوں بعد مقتول نے اپنے والدین کو بتایا کہ نادر نے اُسے دھمکی دی ہے کہ اگر اُس نے پھر کبھی اپنی بیوی کی شکایت اس کے بھائی سے کی تو اُسے بڑا خوفناک نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ مقتول بھلے مانس اور نیک آدمی تھا۔ اُس میں لڑائی جھگڑے اور ہیرا پھیری کی بُو بھی نہیں تھی۔ یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ ڈر گیا تھا یا اپنی عزت کی خاطر چُپ ہو گیا تھا۔ اتنا ضرور پتہ چلا کہ اپنی بیوی کے ساتھ اُس کی بول چال بند ہو گئی تھی۔ مقتول کی دو بہنیں تھیں۔ ایک چھوٹی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور ایک بڑی جس کی شادی مقتول کی شادی سے چند ماہ بعد ہُوئی تھی۔ مقتول کی ماں بیٹے کے گھر نہیں جاتی تھی۔ بہنیں جایا کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ میاں بیوی اکٹھے تو رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے بولتے نہیں۔ بیوی کھانا پکا کر اُس کے آگے رکھ دیتی ہے اور وہ کھا لیتا ہے۔ غم اور پریشانی سے وہ دُبلا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اُس نے طلاق کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کے چال چلن کے خلاف گواہیاں مِل سکتی ہیں، وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر دے کہ اُس کی بیوی بدچلن ہے اس لیے وہ اسے مجبوراً طلاق دینا چاہتا ہے۔ اس طرح اُسے حق مہر اور ماہوار خرچ میں بہت رعایت ہو جائے گی۔

گھر والے اُسے اس کارروائی سے روک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ برادری کے معزز افراد کے سامنے یہ مسئلہ پیش کریں۔ ساڑھے تین سال ہو گئے تھے۔ لڑکی کے ہاں بچے پیدا ہونے کے بھی آثار نہیں تھے۔

لال چُوڑیوں والی قاتلہ

اس لڑکی کے بھائی سے ملنا ضروری تھا جس نے اس کی پٹائی کی تھی۔ مَیں ان لوگوں سے فارغ ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مقتول کی ماں وہاں سے ہلتی نہیں تھی۔ کہتی تھی کہ اس لڑکی کو اور نادر کو اسی درخت کے ساتھ پھانسی دی جائے۔ بڑی مشکل سے اُسے اُٹھایا۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ لڑکی کے بھائی کو بُلا لائے۔ تماشائی قبرستان کے دوسرے سرے پر تھے۔ کانسٹیبل نے اُسے اس ہجوم میں بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ میں اُس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اُس کے گھر آدمی دوڑایا۔ معلوم ہُوا کہ صبح سے کہیں باہر نکل گیا ہے۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا۔

ہسپتال سے ایک کانسٹیبل آیا۔ اُس نے کہا کہ سول سرجن مجھے بلا رہا ہے۔ میں ہسپتال چلا گیا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ مجھے ہسپتال بلانے کی یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ لاش کی بند مُٹھی سے کچھ برآمد ہُوا تھا۔ یہ چُوڑی کا ایک ٹکڑا تھا جس کی لمبائی پون انچ تھی۔ یہ اس طرح ٹوٹا تھا کہ اس کے دونوں سرے سُوئیوں کی طرح نوکیلے ہو گئے تھے۔ ٹکڑا مقتول کے ہاتھ میں رہا اور اُس کی مُٹھی بند ہو گئی۔ ٹکڑے کے دونوں سرے اس کی ہتھیلی میں اُتر گئے۔

میں نے یہ ٹکڑا ابھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ اُن ٹکڑوں جیسا تھا جو میں نے کھڈ سے اُٹھا کر رومال میں باندھے تھے۔ مقتول کی بیوی کی چُوڑیاں

اسی قسم کی تھیں بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ اُسی کی چُوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔

ہتھیلی والے ٹکڑے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی نے اپنے آشنا کی مدد کرتے ہوئے مقتول کو پکڑا ہوگا اور مقتول کے ہاتھ میں لڑکی کی کلائی آگئی ہوگی۔ ایک دو چُوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور یہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ عین اُس وقت اُس کا گلا اتنی زور سے دبایا گیا کہ اُس کی مُٹھیاں بند ہوگئیں اور ٹکڑے کے سرے اُس کی ہتھیلی میں اُتر گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ لڑکی نے قتل میں مدد دی ہے۔

ڈاکٹر نے مجھے لاش کے بازو کا زخم دکھایا۔ ڈاکٹر ایسے زخم پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھ دیا کرتے ہیں۔ وہ بالکل ضروری نہیں سمجھتے کہ تھانیداروں کو بُلا کر زخم دکھائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے مجھے اس لیے بُلا لیا تھا کہ وہ میرا دوست تھا اور میری اس عادت سے واقف تھا کہ مَیں بال کی کھال اُتارا کرتا ہوں۔ یہ زخم کچھ اور ہی قسم کا تھا۔

"لیجئے ملک صاحب! آپ کے ایک مُلزم کی نشاندہی تو میں ہی کر دیتا ہوں" — ڈاکٹر نے مجھے کہا — "وہ لال چُوڑیوں والی ہے اور اُس کا ایک دانت ٹوٹا ہُوا ہے یا آدھا ہے۔ بہرحال اُس کے سامنے کے دانتوں میں ایک دانت کا ٹتا نہیں"۔

ڈاکٹر نے مجھے لاش کا دایاں بازو دکھایا۔ میں نے لاش میں پہلی چیز یہ دیکھی کہ ابھی خراب ہونی شروع نہیں ہُوئی۔ رات بھر باہر ہوا میں لٹکتی رہی

تھی۔ دایاں بازو دیکھا۔ کُہنی سے نیچے جہاں گوشت کا پٹھا زیادہ موٹا ہوتا ہے وہاں کسی انسان کے دانت اُترے ہُوئے تھے۔ اتنی زور سے کسی نے بازو کاٹا تھا کہ وہاں سے خون پھُوٹ کر بہ نکلا تھا۔ اس کے بعد مقتول مر گیا تو خون بند ہوگیا اور زخم پر کُرتہ چپک گیا۔ ڈاکٹر مجھے یہی زخم دکھانا چاہتا تھا۔ اُس نے زخم دھو ڈالا تھا۔ اس کی شکل یہ تھی:

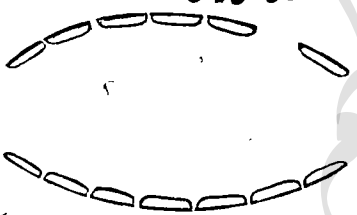

سات دانت نیچے کے گوشت میں اُترے تھے مگر اُوپر کے سات میں سے چھ دانت اُترے تھے۔ دائیں طرف کے آخری دانت کے ساتھ والے دانت کی جگہ خلا تھا۔ میں نے بڑی غور سے دیکھا تو اس خلا میں مجھے ہلکا سا نشان نظر آیا لیکن یہ زخم نہیں تھا۔ صرف دباؤ پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دانت مارنے والے کا دائیں طرف سے ایک دانت ٹوٹا ہُوا ہے۔ اب لاش کو تو دفن ہو جانا تھا۔ میں نے ایک باریک کاغذ لیا۔ اسے زخم پر رکھ کر قلم سے زخموں پر اسی شکل کی لکیریں ڈال لیں۔ اس طرح میرے پاس مندرجہ بالا شکل محفوظ ہوگئی۔ بال برابر فرق نہیں رہنے دیا۔ یہ نہایت کار آمد سراغ تھا۔

میں نے مقتول کی بیوی کو غور سے نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے دانت کیسے

تھے مجھے اب فوری طور پر اُسے پکڑنا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کھانا کھا کر باہر نکلا تھا۔ پوسٹمارٹم رپورٹ نے اسے جھوٹ ثابت کر دیا کیونکہ لاش کا معدہ خالی تھا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت رسّے سے نہیں انسانی ہاتھوں سے گلا دبانے سے واقع ہوئی ہے۔ موت کا وقت رات نو بجے تعین کیا گیا۔ گردن کا منکہ ٹوٹنے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ مقتول کی لاش درخت پر لے جائی گئی اور گلے میں رسّہ ڈال کر پھینکی گئی جس سے منکہ ٹوٹ گیا اور گردن لمبی ہو گئی۔

لاش کے گھٹنوں اور کہنیوں پر ایسے نشان تھے جیسے گھسیٹے گئے ہوں اور کوئی زخم نہیں تھا۔ اس سے میں نے یہ قیاس آرائی کی کہ چاقو مقتول کے پاس تھا۔ اگر قاتل کے پاس ہوتا تو مقتول کے جسم پر چاقو کے زخم ہوتے۔ چاقو کی نوک پر خشک خون تھا۔ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کی لہٰذا یہ کہا جا سکتا تھا کہ قاتل زخمی ہے۔

ڈاکٹر نے اُسی روز چاقو اور مقتول کے کپڑے خون کی شناخت اور گروپ معلوم کرنے کے لیے بھجوا دیئے۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ ان کپڑوں پر صرف مقتول کا خون تھا یا قاتل کا بھی تھا۔

میں یہ سوچتا ہُوا تھانے کی طرف چل پڑا کہ یہ خونی ڈرامہ کس طرح کھیلا گیا۔ میرے سامنے ایک کہانی یہ آئی کہ مقتول کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ کھڈ میں گئی۔ خاوند نے اُس کا تعاقب کیا۔ وہ چاقو لے کر گیا تھا۔ اُس نے دونوں کو عین موقع پر پکڑ لیا۔ چاقو کا وار کیا لیکن بیوی نے یا اُس کے آشنا نے اُس کے ہاتھ

سے چاقو گرانے کے لیے اُس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ یہ حرکت عام طور پر عورتوں کی ہوتی ہے۔ مرد دانتوں سے نہیں کاٹا کرتے۔ چاقو اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ چاقو کے اُوپر لڑائی ہوئی۔ چاقو مٹی میں دب گیا۔ مقتول کو گرایا گیا یا کھڑے کھڑے اُس کا گلا دبا دیا گیا۔

ایک صورت یہ بھی ذہن میں آئی کہ مقتول کسی عورت کے ساتھ اس کھڈ میں تھا کہ عورت کا خاوند تعاقب میں آ گیا۔ اُس نے مقتول کو گلا دبا کر مار دیا۔ اگر ایسا ہُوا تو کیا عورت نے اپنے خاوند کو بچانے کے لیے مقتول کو دانت مارے تھے؟ یا کیا خاوند نے مقتول کو کاٹا اور اُس کے ہاتھ سے چاقو گرایا تھا؟ کیا مقتول ایسے چال چلن کا تھا کہ وہ کسی غیر عورت کو کھڈ میں لے گیا؟ —— یہ سوال مجھے پریشان کر رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مقتول اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی عورت کو ساتھ لے گیا اور کھڈ میں رقابت جاگ اُٹھی۔ دونوں میں لڑائی ہُوئی اور عورت نے قاتل کا ساتھ دیا۔

میں دماغ میں واردات کی کوئی سی بھی خیالی فلم چلاتا تھا تو مقتول کی بیوی کی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔ اگر میری فالتو حِس مجھے دھوکہ نہیں دے رہی تھی تو ملزم بیوی تھی۔ چوڑیاں اُسی کی تھیں۔ باقی کو الف بھی اسی سے ملتے اور اسی کی نشاندہی کرتے تھے۔

زیادہ وقت ضائع کرنا شہادت تباہ کرنے والی بات تھی۔ مجھے فوری طور پر اس حسین اور جوان لڑکی پر اور اُس کے خوبرو اور توانا چچازاد، نادر پر حملہ کرنا اور انہیں گھٹنوں بٹھانا تھا۔ نادر کو میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ اُس کی باتوں سے

ظاہر ہوتا تھا کہ خطرے مول لینے کی ہمت رکھتا ہے اور جسم ایسا تھا کہ مقتول کی لاش اُٹھا کر درخت پر چڑھ سکتا تھا۔ مقتول دُبلا پتلا تھا۔

میں تھانے گیا تو میری ایک مخبر عورت آئی ہوئی تھی۔ یہ اُدھیڑ عمر عورت تھی۔ بدکار نہیں تھی۔ اُس کا خاوند مر گیا تھا۔ گھروں میں محنت مزدوری کر کے بچّوں کو نہ صرف روٹی کھلاتی تھی بلکہ انہیں تعلیم بھی دلا رہی تھی۔ کسی نے مجھے کہا تھا کہ شریف عورت ہے اور مدد کی حقدار۔ میں نے اس کی یہ مدد کی کہ مخبری کی ڈیوٹی دے دی اور خاص طور پر ہدایت دی کہ جھوٹ نہ بولے اور کسی کو دھوکہ نہ دے۔ گھروں میں تو وہ جاتی ہی تھی۔ اس کی زبان میٹھی تھی۔ اس نے پہلے پہل مجھے دو رپورٹیں دیں جو بالکل صحیح تھیں۔ میں اُسے خاصی اُجرت دلا دیتا تھا۔ اُس نے مجھے مقتول کی بیوی اور نادر کے تعلقات کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو مقتول کے والدین بتا چکے تھے۔ اس لڑکی اور نادر کے شادی سے پہلے کے تعلقات تھے جو ابھی تک قائم تھے۔ یہ مُخبر یہ اطلاع بھی لائی کہ مقتول اور اس کی بیوی میں اَن بن تھی۔ طلاق کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن لڑکی طلاق نہیں لینا چاہتی تھی۔

مقتول کے متعلق اُس نے بتایا کہ ہر کوئی اُس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ نیک اور ملنسار تھا۔ زیادہ تر رُجحان مذہب کی طرف تھا۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ بیوی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ داڑھی منڈھوا دو، مجھے بہت بُری لگتی ہے۔ مقتول کی بیوی کی سہیلیوں سے یہ مخبر عورت یہ سُن کر آئی کہ وہ ان کے پاس بیٹھ کر خاوند کا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ بلکہ وہ اس قدر مُنہ پھٹ ہے کہ اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھی ”شادی کسی سے، یاری کسی سے“۔

رات کے کپڑے اور تصویر

میں ان دونوں کو کسی جواز کے بغیر حراست میں نہیں لے سکتا تھا۔ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ دونوں کہیں بھاگ نہ جائیں۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی عثمان سے کہہ کر ان کے گرد جاسوسوں کا حصار کھڑا کر دیا۔ عثمان نے کُھروں کے مولڈ بنانے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور مقتول کے گھر جا دھمکا۔ وہاں تالہ لگا ہُوا تھا کیونکہ گھر کا آدمی مر چکا تھا۔ لاش لواحقین کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مقتول کی بیوی سُسرال میں تھی۔ میں نے اُسے بلوا لیا۔ تالا کھلوا کر اُسے اندر لے گیا۔ اُس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اُس کے دانت دیکھے اور یقین ہو گیا کہ مقتول کے بازو پر اسی کے دانتوں کے نشان ہیں۔ اُس کے دائیں طرف کے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہُوا تھا۔

آج کل سونے کے دانتوں کا فیشن نہیں ہے۔ پاکستان بننے سے دو چار سال پہلے تک بعض مرد اور عورتیں سامنے کے ایک دانت پر خالص سونے کا خول چڑھایا کرتی تھیں۔ بعض شوقین مزاج عورتیں سامنے کے دو دانتوں میں دیا سلائی جتنے چوڑے سوراخ کرا کے ان سوراخوں میں سونے کے کیل ڈلوایا کرتی تھیں۔ امیر لوگ، دانت ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ خالص سونے کا دانت لگوا لیا کرتے تھے۔ فیشن کے کچھ شیدائی ایسے بھی تھے جو سامنے کا ایک

اچھا بھلا دانت نکلوا کر اس کی جگہ سونے کا دانت لگوا لیا کرتے تھے۔ سونے کا دانت یا سونے کا خول دانت کی طرح نیچے سے اتنا تیز نہیں ہوتا تھا کہ قدرتی دانتوں کی طرح کاٹ سکتا۔ خول تو نیچے سے کچھ موٹا ہی ہوتا تھا۔ ایسے دانت کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوتے تھے۔

مقتول کی بیوی بھی انہی شوقینوں میں سے تھی۔ اُس کے اُس دانت پر سونے کا خول چڑھا ہُوا تھا جس نے مقتول کے بازو کے زخم میں خلا پیدا کر دیا تھا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس نے چوڑیاں وہی پہن رکھی تھیں جن کے ٹکڑے میرے پاس محفوظ تھے۔ ان کا ایک ٹکڑا مقتول کی مُٹھی سے برآمد ہُوا تھا۔

میں اُسے اندر کمرے میں لے گیا اور اُسے کہا کہ اُس کے پاس جُوتیوں کے جتنے جوڑے ہیں وہ میرے سامنے رکھ دے۔ اتنے میں اُس کا باپ، ماں اور دیگر رشتہ دار اندر آ گئے۔ میں نے سب کو باہر نکال دیا۔ اُن کی گھبراہٹ قدرتی امر تھا۔ لڑکی بھی ڈری ہُوئی تھی۔ اب میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی کوئی بات نہیں کی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جُوتیوں کے چار جوڑے آگے رکھ دیئے۔ میں نے یہ جوڑے کانسٹیبل کے حوالے کر دیئے۔

"رات کو جو تم نے کپڑے پہنے تھے وہ دکھاؤ۔"

اُس نے پہنے ہُوئے کپڑے دکھا کر کہا — "یہی پہنے تھے۔"

میں نے ان کپڑوں کو غور سے دیکھا۔ کہیں بھی مٹی کا یا گھاس کا یا خون کا نشان نہیں تھا۔ میں نے اُس کے گھر کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ہر ایک

ٹرنک اور سُوٹ کیس کھول کر تمام چیزیں باہر نکالیں۔ ایک سُوٹ کیس مقفل تھا۔ اس کا تالا کھلوا کر ہر چیز باہر نکالی۔ اس میں ریشمی کپڑے اور زیورات تھے۔ سب سے نیچے اخبار کا کاغذ بچھا ہُوا تھا۔ یہ ہٹا کر دیکھا تو اس کے نیچے سے ایک ریشمی رومال برآمد ہُوا جو عطر میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اس میں کاغذات لپٹے ہُوئے تھے۔ رومال کی تہیں کھولیں تو تین نہایت خوبصورت عید کارڈ نکلے جو نادر نے اس کے نام لکھے ہُوئے تھے۔ نادر نے "میری جان سے زیادہ عزیز" لکھا تھا۔ ایک دوہرے عید کارڈ میں سے پوسٹ کارڈ سائز کا ایک فوٹو نکلا۔ یہ نادر اور اس لڑکی کا اکٹھا فوٹو تھا۔ دونوں کے بازو ایک دوسرے کے گلے میں تھے اور ان کے گال ملے ہوئے تھے۔

میں نے عید کارڈ اور فوٹو رومال میں لپیٹ کر رومال جیب میں ڈال لیا۔ لڑکی سے کہا کہ وہ کپڑے اور زیورات سُوٹ کیس میں رکھ کر تالا لگا دے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا کہ یہ سُوٹ کیس اپنے باپ کو دے دو۔ وہ ذرا جھجکی۔ اُس کی تو زبان ہی بند ہو گئی تھی۔

"یہیں نہ پڑا رہنے دوں؟" — اُس نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "چوری کا ڈر ہے۔ میں تمہیں تھانے لے جا رہا ہُوں۔"

"تھانے؟" — اُس نے ایسے کہا جیسے ہلکی سی چیخ ماری ہو، اور اُس نے لپک کر میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ اُس کے آنسو چھوٹ آئے۔ گڑگڑا کر کہنے لگی — "آپ کو اپنے اللہ کا واسطہ ہے، مجھے تھانے نہ لے جائیں۔ آپ

مجھے کیوں تھانے لے جائیں گے؟"

"میں مجبور ہوں" — میں نے جواب دیا — "میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ تمہارے خاوند نے خودکشی کی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔"

"جی ہاں" — اُس نے کہا — "ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ اُس نے خودکشی کی ہے۔ اُسے کسی نے قتل تو نہیں کیا۔ اگر کسی نے اُسے قتل کیا ہے تو مجھے کیا معلوم؟"

"میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ رات کو جو تم نے کپڑے پہن رکھے تھے وہ دکھا دو۔"

اُس نے ہر ملزم کی طرح خدا، رسولؐ اور قرآن کی قسمیں کھا کر کہا کہ اُس نے رات کو یہی کپڑے پہنے تھے جو اُس نے اب پہن رکھے ہیں۔ میں نے اس کے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر کچھ نہ ملا۔ آخر اُس کے باپ کو اندر بُلایا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کا گھر سنبھالیں، میں اسے تفتیش کے لیے تھانے لے جا رہا ہوں۔ باپ بے چارہ تو غش کھانے لگا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا۔

"میں اسے گرفتار نہیں کر رہا۔ تفتیش کے لیے لے جا رہا ہوں" — میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا — "اس کے خاوند نے خودکشی کی ہے جس کی کاغذی کارروائی کے لیے اس کے بیان قلمبند کروں گا۔"

اس سے لڑکی بھی مطمئن ہو گئی۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور تھانے

لے گیا۔ میں تھانیدار تھا مگر انسان بھی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اس لڑکی اور اس کے خاندان کو ذلیل و رُسوا کر دیں گے۔ میرا اصول تو یہ تھا کہ میں مسلمان عورت کو تھانے سے بچایا کرتا تھا اور پوچھ گچھ رات کے وقت وردی اُتار کر اُس کے گھر جا کر کیا کرتا تھا لیکن اس لڑکی کے ساتھ میں کوئی رعایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نیک اور زاہد خاوند کو اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اس بے رحمی سے مروا دیا تھا۔

پولیس انسپکٹر عموماً یوں کرتے ہیں کہ تمام مُشتبہ افراد کو ایک ہی بار تھانے میں بلا کر بٹھا دیتے ہیں۔ میرا طریقہ کار مختلف تھا۔ میں بعض مُشتبہ افراد کو دانستہ نظر انداز کر کے اُن کے پیچھے اپنے جاسُوس اور مخبر چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے ایک دو ساتھیوں کو پکڑ لیتا اور میرے جاسوس اُس کا ردِعمل اور سرگرمیاں دیکھتے رہتے تھے جسے میں آزاد رکھتا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ مجھے نادر کے گھر کی تلاشی لے کر اُسے بھی تھانے بٹھا لینا چاہیئے تھا لیکن میں نے بظاہر اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ اُس پر توجہ مرکوز رکھنے کا کام دو جاسُوسوں کے سپرد تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا:

"مجھے دانتوں سے کاٹو"

لڑکی کو تھانے لے جا کر میں تفتیش کے کمرے میں لے گیا اور دروازہ

اندر سے بند کر دیا۔ اندر ایک چارپائی رکھی تھی اور دو کرسیاں۔ اُسے چارپائی پر بٹھا کر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ہیر پھیر کرنے کی بجائے اُس پر سیدھا حملہ کیا۔

"تمہارے خاوند نے خودکشی نہیں کی" — میں نے کہا۔ "اُسے قتل کیا گیا ہے"۔

"قتل کیا گیا ہے؟" — اُس نے بدک کر کہا — "کس نے؟"

"تم نے اور نادر نے"۔

"اللہ.... اللہ کی قسم...." — اُس کی زبان ہکلا گئی۔

"نہ قسمیں کھاؤ" — میں نے کہا۔ "خدا کو ناراض نہ کرو۔ اُس کی ذاتِ باری سے گناہوں کی بخشش مانگو۔ ہوسکتا ہے ذاتِ باری میرے دل میں رحم ڈال دے اور میں تمہیں سزا سے صاف بچا لوں۔ اگر ساری بات خود بتا دو گی تو فائدے میں رہو گی۔ اگر بات میرے منہ سے کہلواؤ گی تو اس کچی عمر میں جیل جاؤ گی اور اُس وقت نکلو گی جب تمہارے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ تمہاری یہ خوبصورتی جو تمہارے خاوند کے قتل کا باعث بنی ہے جیل خانے میں داخل ہوتے ہی گندگی میں بدل جائے گی"۔

وہ رونے لگی۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ مجھے ایک تو یہ دیکھنا تھا کہ مقتول کے بازو پر اسی کے دانتوں کے زخم تھے اور دوسرے یہ کہ مقتول کا چاقو اس لڑکی کو لگا تھا یا نادر کو۔ میں نے اپنا دایاں بازو لڑکی کے آگے کر کے اُس جگہ اُنگلی رکھی جہاں مقتول کے بازو میں دانت اُترے تھے۔ لڑکی سے کہا کہ یہاں مجھے دانتوں سے کاٹو۔ وہ سمجھی میں مذاق کے موڈ میں آگیا ہوں۔ اُس نے

عجیب سی مسکراہٹ سے میرے بازو پر ہونٹ رکھ دیئے اور بازو چوم کر کہا — "کاٹوں کیوں؟ آپ مجھے کُتیا سمجھتے ہیں"؟

"میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ یہاں کاٹو"۔

اُس نے حیران سا ہو کر میرے بازو کا پٹھا منہ میں لے لیا لیکن اُوپر کے صرف تین دانت گوشت پر رکھے۔ میں نے اُس کا منہ پُورا کھول کر بازو کا پٹھا اس طرح اُس کے منہ میں فِٹ کر دیا کہ اُس کے اُوپر اور نیچے کے سات سات دانت گوشت پر آگئے۔

"زور سے کاٹو" — میں نے کہا۔

اُس نے تھوڑا سا زور لگایا۔

میں نے تحکمانہ گرج سے کہا — "پورے زور سے کاٹو"۔

اُس نے دانت اور دبائے۔

"اور زور سے" — میں نے کہا۔

اُس نے اب کے اتنی زور سے دانت دبائے کہ درد سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

میرے کہے بغیر اُس نے منہ میرے بازو سے ہٹا لیا۔ میں نے دیکھا کہ تمام دانت کھال میں اُتر گئے تھے۔ خون نہیں نکلا تھا۔ سونے کے خول والے دانت کا نشان معمولی تھا۔ میں نے جیب سے وہ باریک کاغذ نکالا جس پر مقتول کے بازو کے زخم کا سکیچ بنایا تھا۔ یہ سکیچ اپنے بازو پر دانتوں کے نشانوں پر رکھا۔ بال برابر فرق تھا۔ میں نے اسی کاغذ کی خالی جگہ نشانوں

پر رکھی۔ کاغذ اتنا باریک تھا کہ اس میں سے دوسری طرف بھی نظر آجا
ہے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے قلم سے نشانوں پر لکیریں ڈالیں۔ یہ کام نہایت
باریک تھا۔ اس سکیچ کو دوسرے سکیچ پر رکھ کر دیکھا۔ یا تو میں سکیچ صحیح نہیں
بنا سکا تھا یا واقعی دونوں میں فرق تھا۔ مجھے ایک بال جتنا فرق نظر آیا۔ البتہ
خلا وہیں تھا۔ میں نے لڑکی کا منہ کھلوا کر اس کے دانت دیکھے۔ اس
سونے کے خول والا دانت قدرتی دانتوں سے ذرا اونچا تھا۔

وہ اس طرح حیرانگی سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے
دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔ میں نے اب یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے جسم پر
چاقو کا زخم ہے یا نہیں اُسے کہا "کپڑے اُتار دو"۔

کمرہ بند تھا۔ ہم دونوں کے سوا اندر کوئی اور نہیں تھا۔ اُس
بلا جھجک شلوار اُتار کر چارپائی پر پھینک دی اور عجیب سی مسکراہٹ سے
مجھے دیکھنے لگی۔ مجھ پر اُس وقت کوئی اور ہی جنون طاری تھا۔

"قمیض بھی اُتار دو" — میں نے کہا۔

اُس نے قمیض بھی اُتار دی اور دوستانہ سی بے حیائی سے بولی —
"پہلے وعدہ کریں کہ مجھے چھوڑ دیں گے" — اور وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

مجھے یُوں دھکہ لگا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار میرے جسم کے سا
لگا دیئے ہوں۔ میں کسی اور خبط میں گم تھا اور وہ کچھ اور سمجھ بیٹھی تھی۔ اُ
نے مجھے پولیس انسپکٹر سے ہوس کار مرد بنا دیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں
تھا کہ اتنی خوبصورت اور ایسی جوان لڑکی میرے قابو میں ہے جو میرے اشا

پر ناچ رہی ہے۔ میں آج بھی خدائے ذوالجلال کا شکر سجدہ ریز ہو کر ادا
کرتا ہوں کہ اُس کی ذاتِ اقدس نے مجھ پر شیطان کا غلبہ کرنے کی بجائے
میرے اندر غُصّے کی آگ بھڑکا دی۔ میں آخر انسان تھا اور مرد تھا۔ اگر میں
ایک دو سیکنڈ سوچ میں پڑ جاتا تو شیطان مجھے دبوچ لیتا۔ تھانیداروں کا
دین اور ایمان ہر وقت باریک سی تار پر چلتا رہتا ہے۔ تھانیداروں کو اکثر
دولت اور عورت اس تار سے لڑھکا کر اوندھے منہ گراتی ہیں۔ قاتل اور
ڈاکو بخشے جاتے ہیں، قانون کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ
تفتیش کتنی ہی پیچیدہ اور دشوار کیوں نہ ہو، تھانیدار ہارنا نہ چاہے تو نہیں
ہارتا۔ اُس کی سب سے بڑی مشکل دولت اور عورت ہوتی ہے۔

معلوم نہیں وہ کونسی قوت تھی جو میرے سینے میں بم کی طرح پھٹی اور
مجھ سے گرج کی طرح کہلوایا — "کھڑی ہو جاؤ"۔

وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اُس کے گرد گھوم کر اُسے ہر طرف سے
سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا — "فوراً کپڑے پہن لو" — اُس کے جسم
پر کوئی زخم نہیں تھا۔

اُس نے حیرت اور خوف سے پوچھا — "کیوں"؟ — پھر آہستہ
سے بولی — "میں نے انکار تو نہیں کیا"۔

میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ میں شاید دو حصّوں میں کٹنے لگا تھا میں
نے اُس کی طرف پیٹھ کر لی اور کہا — "کپڑے پہن لو۔ جلدی کرو" — میرے
ہونٹ اپنے آپ ہل رہے تھے۔ میں نے ذرا دیر بعد محسوس کیا کہ میری

زبان آیتِ کریمہ کا وِرد کر رہی تھی اور میرے دل پر ایسا خوف طاری ہونے لگا تھا جو اس سے پہلے کبھی طاری نہیں ہُوا تھا۔

خدا نے مجھے بچا لیا اور اُس کی آواز سُنائی دی ۔۔۔ "میں نے کپڑے پہن لیے ہیں"۔

"چارپائی پر بیٹھ جاؤ" ۔۔۔ میں نے کہا۔

میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ بہت مشکل سے اپنے آپ کو پولیس انسپکٹر بنایا۔ اُس کی اس حرکت نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ لڑکی خاصی بدکار ہے، ورنہ وہ کپڑے اُتارتے جھجکتی اور شرماتی اور یُوں بے حیائی سے مجھے گُناہ کی دعوت نہ دیتی۔

"تمہارے خاوند کا چاقو کِسے لگا تھا؟" ۔۔۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ۔۔۔ "نادر کو؟"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ۔۔۔ اُس نے حیرانگی سے کہا ۔۔۔ "مجھے آپ کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی"۔

"تو سنو" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں بات الف سے شروع کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ بتا دُوں کہ بات جیل خانے میں ختم ہو گی۔ یہ بتاؤ کہ خاوند تمہیں طلاق کیوں دینا چاہتا تھا؟" ۔۔۔ یہ کہہ کر میں نے وہ فوٹو اُس کے سامنے کر دیا جو اُس نے نادر کے مُنہ کے ساتھ مُنہ لگا کر اُتروایا تھا۔ اُس کا جواب سُنے بغیر میں نے اُس سے پوچھا ۔۔۔ "یہ تصویر کب اُتروائی تھی؟"

"شادی سے پہلے"۔

"شادی کونسی تاریخ کو ہُوئی تھی؟"

اُس نے تاریخ، مہینہ اور سال بتایا۔ میں نے فوٹو اُلٹا کر کے اُسے دکھایا۔ وہاں شادی کے چھ ماہ اور سترہ دن بعد کی تاریخ لکھی تھی۔

"یہ تاریخ پڑھو۔ پڑھ سکتی ہو؟"

"ہاں" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُردو پڑھ سکتی ہوں"۔

"جھُوٹ کیوں بولا؟" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اس سے پہلے بھی تم ایک جھوٹ بول چکی ہو۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ شام کو تمہارا خاوند کھانا کھا کر باہر نکلا تھا مگر اُس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اُس کا پیٹ خالی تھا۔ تم گھر نہیں تھیں۔ تم نادر کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھیں۔ تمہارا خاوند گھر آیا تو کھانا کھائے بغیر تمہارے پیچھے چلا گیا"۔

"قرآن لے آؤ" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں اُس کے ساتھ باہر کبھی نہیں گئی"۔

"کیونکہ تمہارے خاوند کی غیر حاضری میں وہ تمہارے گھر آ جاتا ہے" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "یہاں اگر جھُوٹ بولو گی تو حوالات میں بند کر دوں گا۔ نادر کے ساتھ تمہارے جو تعلقات ہیں وہ اپنی زبان سے بتا دو۔ میرے پاس گواہ موجود ہیں۔ خود بتاؤ گی تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری مدد کروں گا"۔

"پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟" ۔۔۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"پہلے یہ دیکھوں گا کہ تم کتنا سچ اور کتنا جھُوٹ بولتی ہو" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں اپنے وعدے کا پکا رہُوں گا، تم اپنے وعدے کی پکی رہنا، اور یہ نہ بھُولنا کہ تم قتل کے الزام میں پولیس کے پاس ہو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ اپنے

آپ کو جیل خانے بھجوا دو یا عزّت سے آزاد ہو جاؤ۔"

اُس نے سر جُھکا لیا۔ سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پہلے تو اُس کی زبان ہکلائی پھر میری حوصلہ افزائی سے وہ کُھل کر بولنے لگی۔ کہنے لگی ــــ "نادر کی میں مِنّت کیا کرتی تھی کہ اب مجھے آزاد کر دو اور اپنے خاوند کے ساتھ دل لگانے دو مگر وہ کہتا تھا کہ تم اُس کی نہیں میری بیوی ہو۔ میں نے تمہاری خاطر شادی نہیں کی۔ ساری عمر تمہارے ساتھ گزاروں گا" ــــ یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ بہت ہی روئی اور کہنے لگی ــــ "میری حالت کو آپ نہیں جان سکتے۔ دن کو میں نادر کی بیوی ہوتی تھی اور رات کو خاوند کی، مگر یہ بھید کُھل گیا۔ شادی سے پہلے ہماری محبت موتیوں کی طرح صاف رہی۔ ہم نے شادی کے وعدے کیے تھے۔ نادر امیر خاندان کا لڑکا تھا۔ مجھے بڑے قیمتی تحفے اور پیسے دیتا تھا۔ مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ میں نے اُس سے کبھی کوئی چیز نہیں لی تھی۔ ہم لوگ اتنے غریب تو نہیں لیکن نادر کے گھر کے مقابلے میں ہم بہت غریب ہیں۔ میں شادی سے پہلے اُن کے گھر جاتی تھی تو نادر کی ماں مجھ سے گھر کے کام کراتی تھی اور پھر کہتی تھی کہ روٹی نہیں کھائی تو یہاں سے لے جاؤ، ماں کو بھی دینا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس گھر میں میری حالت نوکرانیوں والی تھی۔ صرف نادر تھا جو مجھے کہا کرتا تھا کہ تم میرے دل کی رانی ہو۔ ہم اکیلے بھی ملے تو ہم نے کوئی گندی حرکت نہیں کی....

مجھے بدکاری کے طعنے ملے

"نادر نے بہت کوشش کی کہ اُس کے والدین میرا رشتہ مانگ لیں مگر وہ غریبوں کے ساتھ رشتہ نہیں جوڑنا چاہتے تھے۔ نادر نے بہت ضِد کی اور اُس نے گھر والوں کو طرح طرح کی دھمکیاں بھی دیں۔ اُس کی کسی نے نہ سُنی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے مجھے اُن کے گھر جانے سے منع کر دیا۔ نادر میرے گھر آ جاتا تھا۔ اُس کے باپ کو پتہ چل گیا۔ اُس نے میرے باپ کی بے عزّتی کر دی۔ نادر اکلوتا بیٹا ہے۔ بہت دلیر آدمی ہے کسی کی سُنتا نہیں۔ اُسے میرے باپ نے مِنّت کر کے کہا کہ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔ ہماری برادری ایک ہی ہے۔ ایک ہی ذات ہے لیکن غریب کی تو کوئی ذات نہیں ہوتی۔ ہم چوری چھپے ملتے رہے۔ نادر نے کہیں بھاگ چلنے کا مشورہ دیا جو میں نے اپنے باپ کی عزّت کی خاطر نہیں مانا۔ نادر کے باپ نے اپنے ہاتھوں میرا رشتہ نوازش (مقتول) سے کرا دیا۔ وہ مجھے نادر کی نظروں سے اوجھل کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل کہیں اور تھا اس لیے دل نے نوازش کو قبول نہ کیا۔ اگر وہ نادر کی طرح تندرست اور توانا اور ہنس مُکھ ہوتا تو میں دل پر پتھر رکھ کر اُسے قبول کر لیتی، مگر وہ نادر کے بالکل اُلٹ تھا۔ چُپ چاپ اور بہت ہی سنجیدہ رہتا تھا۔ اُس کی داڑھی تو مجھے بہت ہی بُری لگتی تھی۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ بُرقعہ اوڑھ کر باہر نکلا کرو اور پانچوں نمازیں پڑھا کرو لیکن میں اُسے کہتی تھی کہ میں نے کبھی بُرقعہ نہیں اوڑھا اور اُسے یہ بھی کہا کہ داڑھی صاف کرا دو۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ

مریض تھا۔ کبھی کہتا کہ میری ٹانگیں دُکھتی رہتی ہیں۔ کبھی کہتا کہ سر میں چکّر آتے ہیں۔ گُم صُم رہتا تھا جیسے زندگی سے بیزار ہو۔ حکیموں کی دوائیاں کھاتا رہتا تھا۔ دُبلا پتلا تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی کہ جسے خدا کے نام پر قبول کیا ہے اسے دل سے بھی قبول کروں....

"لیکن اُس نے، اُس کی ماں نے اور اُس کی بہنوں نے میرے پاؤں جمنے نہ دیئے۔ وہ اشاروں اشاروں میں مجھ پر اس شک کا اظہار کرتی رہتیں کہ میں جب میکے جاتی ہوں تو نادر کے ساتھ گلچھرے اُڑاتی ہوں۔ شادی کے چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ خاوند نے مجھے کہا — اگر تمہارے دل سے نادر ابھی نکلا نہیں تو مجھ سے طلاق لے لو۔ میں تم پر زبردستی نہیں کروں گا۔ میں جان گیا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں' — میں اُس کے آگے بہت روئی اور اُسے کہا کہ وہ نادانی کی عمر تھی جب میں نے نادر کو پسند کیا تھا اور اُس نے مجھے دل میں بٹھا لیا تھا۔ تمہارے پاس آئی تو میں کنواری تھی۔ اب بیوی بن گئی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے پچھلی باتیں بھول جانے دیں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اس کی ماں اور بہنیں بھی مجھے شادی سے پہلے کی دوستی کے طعنے دیتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں۔ خاوند پر تو اثر اچھا ہُوا لیکن اُس نے اپنی ماں اور بہنوں کو طعنوں سے منع کیا تو انہوں نے اشاروں کی بجائے مجھے صاف لفظوں میں کہنا شروع کر دیا کہ میں اُن کے بیٹے کی نہیں نادر کی بیوی ہوں۔ مجھ میں خرابی یہ تھی کہ میری طبیعت شوقین تھی۔ مجھے ریشمی کپڑے اچھے لگتے تھے۔ بَن سنور کر رہتی تھی۔ میں نے شادی سے دو سال پہلے باپ اور بھائی سے ضد کر کے اس

دانت پر سونے کا خول چڑھایا تھا، لیکن میں نے گھر کے کام کاج میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ میری دوسری عادت یہ بھی تھی کہ میں گھریلو لڑکیوں کی طرح گھُٹی ہُوئی اور چُپ چاپ نہیں رہتی تھی، ہنسنے کھیلنے اور ہر بات کھُل کر کہنے کی عادی تھی۔ میرے مذاق بکواسی قسم کے ہوتے تھے۔ اس سے میرے سُسرال کی عورتیں مجھے بے حیا اور بدکار کہتی تھیں۔ خدا نے مجھے رنگ سُتھرا اور نقش اچھے دیئے ہیں۔ یہ بھی میرے خلاف استعمال ہوتے تھے....

"مجھ سے کوئی برتن ٹوٹ جائے یا کوئی غلطی ہو جائے تو ساس مجھے بخشتی نہیں تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ دھرے رہتے تھے — 'تُو تو بڑی حویلی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اُن کی بہو تو تُو شادی سے پہلے ہی بن گئی تھی۔ تیرا دھیان اس گھر میں ہو تو برتن نہ ٹوٹیں' — میری قسموں پر اور میرے آنسوؤں پر ان عورتوں نے ذرّہ بھر اعتبار نہ کیا۔ آخر ایک روز میں پھٹ پڑی۔ گھر میں بہت لڑائی ہُوئی۔ نوازش (خاوند) گھر آیا تو ماں اور بہنوں نے اُسے اپنی سُنائی۔ میں نے رات کو تنہائی میں اپنی سُنائی۔ وہ بُدھو آدمی تھا۔ سوائے پریشان ہونے کے کچھ بھی نہ کر سکا۔ پھر نوک جھونک کا یہ سلسلہ روزمرّہ کا معمول بن گیا۔ میں نے اِن لوگوں کا کوئی لحاظ اور احترام نہیں کیا۔ خاوند کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سے الگ ہو جائے، میں ان کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں اتنی تنگ آ گئی تھی کہ ایک روز نادر سے کہا کہ مجھے اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے لیے الگ مکان چاہیئے۔ اُن کا ایک مکان کرائے پر چڑھا ہُوا تھا۔ وہ اُس نے خالی کرا دیا اور میں خاوند کے ساتھ وہاں چلی گئی۔ نادر ہم سے

کرایہ نہیں لیتا تھا۔ لوگوں کو ہم چار روپے کرایہ بتاتے تھے....

"سسرال نے ساری برادری میں یہ مشہور کر دیا کہ میں نادر سے آزادی سے ملنے کے لیے خاوند کو الگ لے گئی ہوں۔ میں پتھر تو نہیں تھی۔ ان لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ جس گناہ سے میں بچ رہی تھی وہ کر گزروں۔ بدنام تو میں ہو ہی گئی تھی۔ خاوند کو میں اپنے اُوپر جبر کر کے قبول کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں سب کی نظروں میں بے وفا اور مجرم تھی۔ ایک روز خاوند کام پر گیا تو نادر میرے گھر آگیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ اُس نے مجھ سے شادی سے پہلے کی محبت مانگی....

"میں جلی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر کے کہا —— 'میرے سسرال اور خاوند نے تمہیں میرا خاوند بنا رکھا ہے۔ آؤ، آج سے تم ہی میرے خاوند ہو' —— یہی ایک گناہ تھا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے شرم اتار دی اور اُس کی بیوی بن گئی۔ میں نے وہ کپڑے پہنے جو مجھے بہت پسند تھے۔ نادر کے ساتھ بازار گئی اور اُس کے ساتھ یہ تصویر اُتروائی جو آپ کے پاس ہے۔ خاوند بے خبر نہیں تھا۔ نادر اُس کی موجودگی میں بھی آجاتا تھا۔ خاوند نے مجھے کئی بار نادر سے دوستی ترک کرنے کو کہا لیکن میں اُسے یہ کہتی تھی کہ داڑھی صاف کرا دو، کھاؤ پیو اور نادر کی طرح تندرست اور توانا بنو....

"وہ بے چارہ طبیعت کا بھی کمزور تھا اور جسم کا بھی۔ مجھے طلاق دینا چاہتا تھا لیکن اُس کے پاس حق مہر کی رقم نہیں تھی۔ طلاق سے اُسے ماں باپ بھی روکتے تھے۔"

"نادر نے تمہیں کبھی نہیں کہا تھا کہ اس سے طلاق لے لو اور کہیں بھاگ چلیں"؟ —— میں نے پوچھا۔

"اُس نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ بھاگ چلیں" —— اُس نے جواب دیا —— "شادی کے بعد جب وہ میرے گھر آنے لگا تو میں نے اُسے بتایا کہ نوازش مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ نادر نے مجھے سختی سے کہا کہ طلاق نہ لینا کیونکہ طلاق کے بعد بھی تمہاری شادی میرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ہو گا یہ کہ تمہیں کہیں ایسی جگہ بیاہ دیں گے جہاں ہمارا اتنی آزادی سے ملنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بدنامی کی وجہ سے تمہیں کوئی بھی قبول نہ کرے۔ پھر تم اپنے گھر میں قید ہو جاؤ گی....

"میں نے خاوند سے کہہ دیا کہ تم طلاق دینا چاہتے ہو تو دے دو، میں اس گھر سے نہیں نکلوں گی۔ اگر نکلوں گی تو پانچ ہزار روپیہ نقد لے کر نکلوں گی اور بیس روپیہ ماہوار خرچ ٹھونک بجا کر لوں گی۔ اس کے بعد میری اور اُس کی بول چال بند ہو گئی۔ میں اُس کے لیے کھانا پکا دیتی تھی۔ گھر کے سارے کام کرتی تھی مگر ہم میاں بیوی نہیں رہے تھے۔ میں اب نادر کی بیوی تھی۔ خاوند بالکل ہی چُپ چاپ اور گُم صُم رہنے لگا۔ میں نے اُسے کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا نہ کبھی اُس سے لڑی۔ اُس نے ایک بار میرے بڑے بھائی سے شکایت کی۔ بھائی نے میرے گھر آکر مجھے بہت مارا اور کہا کہ نوازش کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لی، مگر یہ جھوٹی اور دکھاوے کی معافی تھی۔"

"نادر نے کبھی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ نوازش کو کسی طریقے سے

راستے سے ہٹا دیا جائے؟" — میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو کہا کرتا تھا کہ دُعا کرو نوازش زندہ رہے ورنہ ہماری ملاقاتیں ختم ہو جائیں گی۔ ایسا بُدھو اور بُزدل خاوند تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔"

"تم یہ بتا سکتی ہو کہ تمہارے خاوند کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ تھے؟" — میں نے پوچھا — "ہو سکتا ہے اتفاقاً ہی کہیں دوستی لگا رکھی ہو۔"

"میں نہیں مان سکتی" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو پکا مومن تھا، اور کوئی عورت اُسے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کسی عورت کے مطلب کا آدمی تھا ہی نہیں۔"

میں نے لڑکی پر بہت جرح کی۔ مجھے شک تھا کہ وہ نادر کو بچانے کے لیے کہہ رہی ہے کہ وہ کہتا تھا کہ طلاق نہ لینا اور اُسے راستے سے نہ ہٹانا، اور اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو قتل کی وجہ کیا تھی؟ اور قاتل کون تھا؟ اور چُوڑیوں والی عورت کون تھی؟ میں نے مقتول کی بیوی کا خول والا دانت ایک بار پھر دیکھا اور مقتول کے بازو کے زخم کو ذہن میں لا کر سوچنے لگا کہ باقی دانت اتنے گہرے اُتر گئے تھے کہ خول کو بھی ذرا سا کھال میں اُترنا چاہیئے تھا۔ اس لڑکی نے مجھے اپنی جو چُوڑیاں دکھائی تھیں اُن کے سائز موقعۂ واردات کے کھُروں سے ملتے تھے، باقی کوئی مشابہت نہیں تھی۔ تو کیا میں غلط لڑکی سے تفتیش کر رہا تھا؟ صرف اتنی سی بات تھی کہ چُوڑیاں وُہی تھیں اور اب اُس نے یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ نادر کے ساتھ اُس کے ناجائز مراسم تھے۔

ذہن پر زور دیا تو یہ شک اُبھرا کہ اس لڑکی میں بے حیائی کی کوئی کمی نہیں ہو سکتا ہے کسی اور کے ساتھ بھی اس کی آشنائی ہو اور اُس آشنا نے اسے کہا ہو کہ مقتول کو راستے سے ہٹا کر شادی کر لیں گے۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا — "نادر ہے تو میں کسی کے مُنہ پر تھوکتی بھی نہیں۔"

اسے میں آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے بہت منت سماجت کی کہ اُسے گھر جانے دُوں لیکن میں نے اُسے ایک صاف سُتھرے کمرے میں جا بٹھایا۔ اُس کے لیے کھانا منگوایا اور تسلی دی کہ وہ اپنے آپ کو حراست میں نہ سمجھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ واقعی خاوند کے قتل کی مجرم تھی مگر مجھے اس ثبوت کی بھی ضرورت تھی کہ وہ بے گناہ ہے۔ نادر کا بیان ضروری تھا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ میں نے دو کانسٹیبل ساتھ لیے اور نادر کے گھر چلا گیا۔ وہ مقتول کے جنازے سے واپس آ رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور اُس کے گھر کی تلاشی لی۔ یہ امیروں اور عزّت داروں کا بہت بڑا گھر تھا۔ اس گھر میں پولیس کا چھاپہ اور تلاشی بہت بڑا واقعہ تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ نادر کے باپ کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ مجھے خانہ تلاشی سے روکنے لگا۔ میں نے نادر کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے کہا — "اسے کہو کہ رات اس نے جو کپڑے پہنے تھے وہ میرے حوالے کر دے۔ میں گھر کی تلاشی نہیں لُوں گا۔"

انہوں نے مجھے صاف سُتھرے کپڑے دکھا دیئے۔ میں نے سارے

گھر کی تلاشی لی۔ یہ بھی معلوم کیا کہ کپڑے دھوبی کے پاس جاتے ہیں یا گھر دُھلتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کپڑے گھر دُھلتے ہیں اور گھر ہی استری ہوتے ہیں۔

کوئی کام کی چیز نہ ملی سوائے رشوت کی پیش کش کے۔ میں نے نادر کے باپ کو الگ لے جا کر پوچھا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ نادر کے تعلقات کیسے تھے۔

"میرا بیٹا تو مٹی کا باوا ہے جی" — باپ نے جواب دیا — "اسے کوئی جدھر لگائے لگ جاتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ لڑکی اسے اُلّو بنائے رکھتی ہے۔ ویسے کوئی گڑبڑ والی بات نہیں۔ نوازش کے ساتھ نادر کی گہری دوستی تھی۔"

بوڑھے نے اپنے بیٹے کو مٹی کا باوا اور مجھے اُلّو کا پٹھا بنانے کی بہت کوشش کی۔

میں نے اُسے اتنا ہی کہا "آپ اُس تھانیدار کے ساتھ بات کر رہے ہیں جو مٹی کے باووں کو تھانے لے جا کر اُن میں جان ڈال دیا کرتا ہے اور وہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

میں نادر کو تھانے لے گیا اور اُسی کمرے میں اُسی چارپائی پر بٹھا دیا جہاں اُس کی 'جان سے زیادہ عزیز' کو بٹھا کر ساری کہانی سُنی تھی۔ باپ کی طرح بیٹا بھی طرح دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ مقتول کی بیوی کو میں تھانے لے آیا ہوں۔

"وہ کہاں ہے؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پوچھا کون تو اُس نے کہا — "نوازش کی بیوی"۔

"نوازش کی بیوی یا تمہاری؟" — میں نے مسکرا کر کہا۔

"آپ داروغہ ہیں" — اُس نے غصّے کو دباتے ہوئے کہا — "میں آپ کے تھانے میں ہوں۔ آپ کے منہ میں جو آئے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ آج ہی بیوہ ہوئی ہے اور اس کی بھی عزت ہے"۔

"گھبراؤ نہیں دوست" — میں نے کہا — "اُسے میں نے عزت سے الگ کمرے میں بٹھا رکھا ہے۔ ابھی تو اُس کے ساتھ بات بھی نہیں کی۔ پہلے تمہارے ساتھ دو چار باتیں کر کے اُسے تمہارے سامنے بٹھاؤں گا۔ اگر تم نے مجھے مطمئن کر دیا تو دونوں کو باعزت طریقے سے گھر بھیج دوں گا.... مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے یہ رپورٹ کس طرح اعتماد کے ساتھ دی تھی کہ نوازش نے خودکشی کی ہے؟"

"اُس کی لاش درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "گلے میں رسّہ تھا"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اُسے قتل کر کے لاش درخت کے ساتھ لٹکا دی ہو"۔

"ہو سکتا ہے" — اُس نے کہا — "لیکن میں پولیس انسپکٹر نہیں ہوں۔ اگر لاش زمین پر ہوتی، گلے میں رسّہ نہ ہوتا تو میں کہتا کہ نوازش قتل ہو گیا ہے خواہ اُس نے خودکشی ہی کی ہوتی"۔

"نوازش کو قتل کر کے درخت کے ساتھ لٹکایا گیا ہے" — میں نے کہا۔

اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ وہ نیک اور پارسا آدمی تھا۔ اُسے راستے سے ہٹایا گیا ہے۔ اس جرم میں اُس کی بیوی بھی شریک ہے کیونکہ وہ خاوند کو ناپسند کرتی تھی اور کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"اور کسے چاہتی تھی؟"

"نادر نام کے ایک جوان آدمی کو" ــــ میں نے کہا ــــ "اور وہ نادر شاید تم ہی ہو۔"

محبت ہو تو ایسی ہو

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے نوازش کو قتل کیا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ کا یہ شک محض وہم ہے۔"

"تو میری مدد کرو" ــــ میں نے کہا ــــ "میرا یہ وہم دُور کر دو اور میری راہنمائی کرو کہ نوازش کا قاتل کون ہے۔"

"میں نہیں ہوں" اُس نے کہا ــــ "میں ساری رات گھر رہا ہوں۔ رات آٹھ بجے ہمارے گھر فیض آباد سے چھ مہمان اچانک آ گئے تھے۔ اُن میں چار عورتیں ہیں۔ اُن سے پوچھ لیں کہ میں آٹھ بجے گھر تھا۔ اُن کی خاطر تواضع اور کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا۔ رات ساڑھے دس گیارہ انہی کے ساتھ بج گئے۔ وہ میرے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے رشتہ دینا چاہتے ہیں اور میری بہن کا رشتہ لینا چاہتے ہیں۔ میں اپنے رشتے کی مخالفت کر رہا تھا۔

مہمان عورتوں نے مجھے گھیرے رکھا اور رات کا ایک بج گیا۔"

"اپنے رشتے کی مخالفت کیوں کرتے رہے ہو؟"

"مجھے وہ لڑکی پسند نہیں۔"

"تم کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"بات صاف کرو گے تو فائدے میں رہو گے" ــــ میں نے کہا ــــ "صاف کہہ دو کہ تم نوازش کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ بولو، ہاں یہ دُرست ہے۔"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا ــــ "تم اس کے ساتھ شادی نہ کر سکے مگر شادی کے بغیر اُس کے خاوند بن گئے۔ بولو۔ جواب دو۔ کہو ہاں یا نہیں۔"

"میں اس لڑکی سے محبت ضرور کرتا ہوں" ــــ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور پُرجوش لہجے میں کہا ــــ "اگر آپ کو یہ شک ہے کہ نوازش کی بیوی نے اُسے قتل کیا ہے اور اگر آپ اسے اس جرم میں پکڑنا چاہتے ہیں تو اُسے چھوڑ دیں۔ کاغذ قلم لیں اور جو بیان آپ کے دل میں آتا ہے خود ہی لکھیں۔ مجھے قاتل لکھیں اور اس پر میرے دستخط کرا لیں۔ اس لڑکی کو تھانے سے باہر نکال دیں۔ سارا الزام میرے سر پر رکھ دیں۔ پھانسی کا رسہ میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں نے جس لڑکی کو اس دل کے اندر رکھا ہوا ہے اُس کی خاطر جان بھی

دے سکتا ہوں۔ اُسے چھوڑ دیں لیکن میں آپ کو بتا دُوں کہ اگلے جہان آپ کے گلے میں پٹہ ڈال کر خدا کے سامنے کھڑا کروں گا اور کہوں گا کہ یہ ہے وہ داروغہ جو بے گناہوں کو سُولی چڑھا دیتا تھا۔"

"تم پھانسی کا رسہ اپنے گلے میں کیوں ڈالتے ہو؟" میں نے بڑے ہی تحمل سے کہا — "میں نے کہا ہے کہ میں اندھیرے میں ہُوں، میرا ہاتھ پکڑو اور مجھے دو باتیں بتاؤ۔ ایک یہ کہ تم قاتل نہیں ہو اور دوسری یہ کہ قاتل کون ہو سکتا ہے.... سنو نادر! میں جانتا ہُوں تم دل و جان سے تنویر (مقتول کی بیوی) پر فدا ہو۔ تم نے اس کے لیے یہ قربانی بھی کی ہے کہ شادی نہیں کی مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تنویر کا چاہنے والا کوئی اور بھی ہو اور اُس نے اُسے کہا ہو کہ خاوند کو راستے سے ہٹاؤ اور میں تمہارے ساتھ شادی کر لُوں گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" — اُس نے کہا — "خاوند نے تنویر کو پچاس بار کہا تھا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں لیکن اُس نے طلاق نہیں لی تھی۔ نوازش جتنا شریف تھا اتنی ہی شرافت سے وہ تنویر کے راستے سے خود ہی ہٹ رہا تھا مگر تنویر نہیں مانتی تھی۔"

"کیونکہ تم نے اُسے کہا تھا کہ طلاق نہ لینا" — میں نے کہا — "تم نوازش کے پردے میں ملاقاتوں کا سلسلہ آسانی سے جاری رکھ سکتے تھے۔"

"یہ بات نہیں" — اُس نے کہا — "میں نے اُسے طلاق لینے سے روکا ضرور تھا لیکن اس لیے روکا تھا کہ وہ بہت بدنام ہو جائے گی اور ساری عمر گھر بیٹھی رہے گی۔ بدنام لڑکی کے ساتھ کون شادی کرتا ہے؟"

"اس کے ساتھ تمہارے تعلقات بہنوں بھائیوں والے تھے یا میاں بیوی والے؟"

"ان کے درمیان درمیان سمجھ لیں۔"

"جنہیں ناجائز کہا جاتا ہے" — میں نے کہا۔

"آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟" — اُس نے پوچھا، اور چونک کر بولا — "اوہ .... میں سمجھ گیا۔ آپ نے پیپل کے نیچے بیٹھے نوازش کے باپ اور اُس کی ماں کو بُلایا تھا اور تین گھنٹے بیان لیتے رہے تھے۔ انہوں نے تنویر کے اور میرے خلاف بہت بکواس کی ہو گی۔ تنویر کو انہوں نے رنڈی اور بازاری کہہ کہ گھر سے نکالا تھا۔"

"انہیں اس کے خلاف کیا دشمنی تھی؟"

"دشمنی تو کوئی نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "وجہ یہ ہے کہ جن کی اپنی بیٹیاں بدکار ہوتی ہیں وہ دوسروں کی بیٹیوں کو بھی بدکار سمجھتے ہیں۔ نوازش کی بڑی بہن کی شادی نوازش کی شادی سے تین ماہ بعد ہُوئی تھی۔ تین سال سے اُس کا خاوند دق کا مریض ہے۔ اس عورت نے تنویر کے بھائی کے ساتھ رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ ساری برادری جانتی ہے۔"

"یہ وہی بھائی تو نہیں جس نے ایک بار تنویر کو اس کے خاوند کی شکایت پر مارا پیٹا تھا؟" — میں نے پوچھا اور میں کچھ پریشان بھی ہُوا کیونکہ یہ آدمی میرے تفتیشی ڈھانچے کو بگاڑ کر باتوں باتوں میں مجھے کسی اور ہی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے یہی طریقہ اپنا لیا۔ اس طریقے کے تحت مُشتبہ کو کُھل کر بولنے کا موقع دیا

جاتا ہے۔ اگر وہ باتونی ہو تو اُسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُس کے منہ سے وہ باتیں بھی نکل جا رہی ہیں جو اگر تھانیدار اُس سے پوچھے تو وہ کبھی نہ بتائے۔

میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا — "جی ہاں، یہ وہی بھائی ہے جس نے تنویر کو بہت بُری طرح پیٹا تھا، لیکن نوازش کے والدین نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس پٹائی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نوازش نے تنویر کے خلاف شکایت کی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ تنویر ایک روز سسرال گئی۔ نوازش کی شادی شدہ بہن گھر آئی ہوئی تھی۔ تنویر کی ساس اور نوازش کی بڑی بہن نے تنویر کو پھر وہی طعنہ دیا کہ وہ نادر کو خصم بنانے کے لیے خاوند کو ماں باپ سے الگ کر کے لے گئی ہے۔ تنویر نے نوازش کی بڑی بہن سے کہا — 'اگر نادر میرا خصم ہے تو تم نے میرے بھائی کو خصم بنا رکھا ہے۔ تمہارا اپنا خاوند تو سُوکھے سے مر رہا ہے۔ میرے بھائی کی جُوئے کی ساری آمدنی تیرے اندر جا رہی ہے' — اُدھر نوازش کی بہن نے تنویر کے بھائی کو یہ بات بتا دی۔ اِدھر نوازش نے اُسے کہا کہ اپنی بہن کو سمجھاؤ، وہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ بھائی صاحب کو غصّہ دوسری بات کا تھا جو اُس نے شریف بن کر نوازش کی شکایت کو سامنے رکھ کر نکالا۔ تنویر کے ساتھ میرے تعلقات جیسے کیسے بھی تھے، بہت پُرانے تھے۔ اس سے پہلے اُسے کیوں غصّہ نہ آیا؟"

میرا سر چکرانے لگا۔ اس لیے نہیں کہ تفتیش پیچیدہ ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ ہندوؤں کی اکثریت کے علاقے میں یہ چند ایک مسلمان گھرانے تھے جن کی بہو، بیٹیاں اور بیٹے بدکاری اور فریب کاری میں پڑے ہُوئے تھے اور ہندو

تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے نادر پر جرح شروع کر دی۔ اُس نے جھوٹے جواب بھی دیئے اور سچّے بھی۔ تنویر کے ساتھ اپنی فوٹو دیکھ کر اُس نے بتایا کہ شادی کے بعد کی ہے۔ بہرحال اُس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ اُس کے مراسم تھے۔

اُس کے تمام جُوتوں کے تلوے دیکھے۔ کھُروں میں فرق تھا۔ اُس کے کپڑے اُتروا کر دیکھے۔ اُس کے جسم پر خراش تک نہیں تھی۔ میں نے رات گیارہ بجے تک اُس پر گھما گھما کر اور پھیر پھیر کر سوال کیے۔ اپنا پورا تجربہ آزما ڈالا مگر اُس نے میرے شک کو ہلا ڈالا اور میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ نوازش کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں۔

خُدا کا اشارہ ملا

میں نے اُسے اپنے دفتر میں جا بٹھایا۔ اُس کے لیے نہایت اچھا کھانا منگوایا۔ وہ تنویر کے لیے بہت پریشان تھا۔ میں نے ہر پہلو پر غور کیا۔ آخر تنویر کو بُلا کر اُس کے پاس بٹھا دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ سونا چاہیں تو بستر چارپائی کا بندوبست کر دیتا ہوں لیکن ابھی اُنہیں آزاد نہیں کروں گا۔ دراصل مجھے خود آرام کی ضرورت تھی۔ دماغ شل ہو گیا تھا۔ سارا دن بک بک کرتے گزر گیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو میری مدد کریں۔ دماغ پر زور دیں اور میں جب واپس آؤں تو مجھے مایوس نہ کریں۔

میں گھر چلا گیا۔ نہا دھو کر کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ فوراً آنکھ لگ گئی۔ کہتے ہیں بلّی کو خواب میں بھی چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تھانیدار خواب میں بھی تفتیش ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خواب میں ایک درخت کے ساتھ ایک لاش لٹکتی دیکھی۔ اس کے نیچے ایک آدمی کھڑا مجھے کہہ رہا تھا — "اسے میں نے قتل کر کے اُوپر لٹکا دیا ہے۔ تم لاش لے جاؤ، میں اپنا رسّہ لے جاتا ہوں" — میں نے اُس سے پوچھا — "یہ کس کی لاش ہے؟" — اُس نے جواب دیا — "یہ میری بہن کا خاوند تھا" — میں لاش کو اُتارنے کے لیے درخت پر چڑھنے لگا تو میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے جلدی سے ٹارچ جلائی اور گھڑی دیکھی۔ سحر کے تین بجنے والے تھے۔

کیا خدا نے مجھے کوئی اشارہ دیا تھا؟ مقتول کی بیوی کے بھائی کو تو میں تھانے بلانا ہی چاہتا تھا۔ اب جبکہ نادر نے بتایا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ مقتول کی بہن کے مراسم تھے تو اُسے تفتیش میں شامل کرنا اور زیادہ ضروری ہو گیا تھا، مگر میں سوچنے لگا کہ خواب میں وہ مجھے کیوں نظر آیا ہے۔ میں وہمی آدمی نہیں تھا پھر بھی خواب میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔ رسّے کے متعلق تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مقتول کی لاش جس رسّے سے بندھی تھی وہ بالکل نیا تھا اور یہ وہ رسّہ تھا جس سے کنوئیں میں سے پانی نکالنے والا ڈول باندھا جاتا ہے۔

وہ چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں صرف ایک بازار تھا۔ اس میں رسّیوں وغیرہ کی صرف ایک دکان تھی۔ رسّہ وہیں سے خریدا گیا ہو گا۔ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں

تھا کہ رسّہ کس نے خریدا تھا۔ ابھی تو تین بجے تھے۔ دکانیں کھلنے میں چار پانچ گھنٹے باقی تھے۔ میں تھانے میں گیا۔ برآمدے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ نادر اور تنویر سوئے ہوئے تھے۔ حوالات کا سنتری اُن کے قریب رائفل تھامے کھڑا تھا۔ میں نے دونوں کو جگا لیا اور دفتر میں لے گیا۔ تفتیش کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے۔ ملزموں پر جوں جوں نیند کا غلبہ ہوتا ہے وہ بے قابو ہو کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

میں نے دونوں کو اکٹھا بٹھا کر وہی سوالات دُہرانے شروع کر دیئے جو میں اُن سے کئی کئی بار پوچھ چکا تھا۔ تنویر سے میں نے کہا کہ تم نے اپنے بھائی کے متعلق یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے خاوند کی بہن کے ساتھ اس کی درپردہ دوستی ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہ تھا؟

اُس نے جواب دینے کی بجائے نادر کی طرف دیکھا۔ نادر نے اُسے کہا — "انہیں میں نے بتایا تھا۔ تم بھی بتا دو۔ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"ہاں جی۔ یہ ٹھیک ہے" — لڑکی نے مجھے کہا۔

میں نے پھر پوچھا کہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟

"دراصل وجہ یہ ہے جی کہ میرا خاوند اس وجہ سے بھی بہت پریشان رہتا تھا کہ اس کی بہن اتنی زیادہ بدنام ہے" — اُس نے جواب دیا — "یہ بھی تو اُس کی خودکشی کی وجہ تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ آپ کو اپنے بھائی کے متعلق بتا دیا تو آپ اُسے بھی پکڑ لیں گے، اور میں اس لیے بھی ڈرتی تھی کہ بھائی کو پتہ چل گیا کہ میں نے اُس کے خلاف پولیس کو کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے جان سے مار دے

گا۔ وہ طبیعت کا بہت سخت ہے۔ اپنی بیوی کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پیٹ ڈالتا ہے۔"

"اُس کی بیوی کیسی ہے؟"

"جیسا میرا خاوند تھا"— اس نے جواب دیا— "بالکل سیدھی سادی اور غریب طبع ہے۔ اگر اُس کی شادی میرے خاوند کے ساتھ ہو جاتی تو دونوں بہت خوش رہتے۔ بے چاری خاموشی سے مار کھا لیتی ہے۔"

"وہ کنوئیں والی بات بھی سُنا دو"— نادر نے اُسے کہا۔

"ایک روز اُس کی بیوی نے اُسے کہہ دیا کہ تم اگر باہر کی دوستیوں سے خوش ہو تو میں کیوں نہ کنوئیں میں ڈوب مروں۔ میرے بھائی نے اُسی وقت کنوئیں کے رستے سے اُس کی دونوں ٹانگیں باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دیا۔ وہ بے چاری چیخنے لگی۔ ہم نے اُسے بڑی مشکل سے چھڑایا تھا۔"

"کنواں کہاں تھا؟"

"ہمارے صحن میں کنواں ہے"— تنویر نے جواب دیا۔

قصبوں میں نلکے نہیں ہوتے تھے۔ اکثر لوگوں نے گھروں میں کنوئیں کھود رکھے تھے۔ وہ علاقہ دریا کے قریب تھا۔ گیارہ بارہ گز تک پانی نکل آتا تھا۔ لڑکی نے جونہی کنوئیں کا نام لیا مجھے رسّہ یاد آ گیا۔ لاش والا یہ رسّہ کنوئیں کے ڈول والا تھا اور نیا تھا۔

"تمہارا بھائی کیا کام کرتا ہے؟"— میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"گھر میں ایک بھینس اور ایک گائے رکھی ہوئی ہے"— اُس نے

جواب دیا— "محلے والے اُس سے گھر سے ہی دُودھ لے جاتے ہیں.... اور وہ باہر سے بھی کچھ کما لاتا ہے۔"

"وہ جوا بھی کھیلتا ہے"— نادر بول پڑا— "اُس کی باہر کی سوسائٹی اچھی نہیں۔ چرس بھی پیتا ہے۔"

"تم نے اُسے کب دیکھا تھا؟"— میں نے تنویر سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے چھ سات مہینے ہو گئے ہیں"— تنویر نے جواب دیا۔

"میں نے اُسے کل صبح دیکھا تھا"— نادر نے کہا۔

اب تو میں نے انہیں اس آدمی سے ہٹنے نہ دیا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا کہ مجھے قاتل مل گیا ہے یا قاتل کا ساتھی۔ البتہ اس سوچ نے مجھے اُلجھا دیا کہ اس کے ساتھ کھڈ میں عورت کون تھی؟ وہ اس کی بہن نہیں ہو سکتی تھی۔ بہن ہوتی تو اپنے سگے بھائی کو کاٹتی نہ اور اُسے قتل نہ کراتی۔ وہ کوئی اور عورت ہو گی جس کے ساتھ مقتول کے تعلقات ہوں گے اور درمیان میں تنویر کا بھائی آ گیا ہو گا۔ پھر خیال آیا کہ بھائی ہو گا نہ بہن۔ تنویر اور نادر ہی ہوں گے یا کوئی اور ہوں گے۔ بہرحال قتل میں ایک عورت ضرور شریک تھی۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"کل میں نے اُسے بہت ڈھونڈا ہے وہ کہیں ملا نہیں"— میں نے نادر سے کہا— "اُس کے گھر دو دفعہ آدمی بھیجا۔ وہ گھر بھی نہ ملا۔ تم نے اُسے قبرستان میں جو لوگ جمع تھے ان میں دیکھا تھا؟"

"میں نے اس سے پہلے اُسے دیکھا تھا"— نادر نے جواب دیا—

"مجھے جب پتہ چلا کہ نوازش کی لاش درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے تو میں لاش کو دیکھ کر تنویر کے گھر کو چل پڑا۔ راستے میں بندرائل ڈسپنسر کی دکان میں تنویر کے بھائی کو دیکھا۔ بندرائل اُس کی بائیں ران پر پٹی باندھ رہا تھا۔ میں دکان میں چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے معلوم ہے کہ نوازش نے خودکشی کر لی ہے؟ اُس نے جواب دیا — "ہاں یار، میں نے ابھی ابھی سُنا ہے۔ رات کو میں بھینس کے کیل سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔ نیچے کدال سیدھی پڑی تھی۔ اس نے ٹانگ کاٹ دی ہے۔ بندرائل کو پٹی کے لیے جگا کر لایا ہُوں"۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری بہن کے گھر جا رہا ہُوں۔ تم بھی چلو، تھانے رپورٹ درج کرانی ہو گی۔ اُس نے کہا — "تم چلو، میں آتا ہُوں" — پھر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

میری فالتو حِس جاگ پڑی۔ وقت دیکھا۔ چار بج چکے تھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ ناشتے کے وقت ان دونوں کے لیے گھر سے ناشتہ لا دے۔ اور ان دونوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو تھوڑی دیر اور سو لیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو باہر بُلا کر پوچھا کہ اِسے بندرائل ڈسپنسر کے گھر کا علم ہے؟ بندرائل کسی ڈگری کے بغیر معمولی سی ڈاکٹری اور مرہم پٹی کیا کرتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے تین چار کانسٹیبلوں سے پوچھا تو ایک نے بتایا کہ اُسے گھر کا علم ہے۔ میں اُسے ساتھ لے کے چل پڑا۔

بندرائل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا تو پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"اکمل نام کے ایک آدمی نے کل صبح تمہیں گھر سے جگا کر دکان کھلوائی اور ران

کے زخم پر مرہم پٹی کرائی تھی" — میں نے اُس سے پوچھا — "وہ زخم کیسا تھا؟"

"کہتا تھا کدال پر گرا ہُوں" — بندرائل نے جواب دیا — "لیکن زخم کدال کا نہیں تھا۔ میں اتنا بُوڑھا ہو گیا ہُوں۔ سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر رہ چکا ہوں۔ سُوئی سے لے کر کلہاڑی تک کے زخم دیکھے ہیں۔ اس شخص کا زخم نوکدار چیز کا تھا۔ تقریباً پون انچ گہرا تھا۔ یہ چاقو، چھُری اور خنجر کی نوک کا بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال کدال کا نہیں تھا۔"

"زخم تازہ تھا؟" — میں نے پوچھا — "زخم کے فوراً بعد وہ تمہارے پاس آ گیا تھا؟"

"نہیں" — بندرائل نے کہا — "زخم رات کا تھا۔ اُس نے اس میں کورے سُوت کی اَنٹی جلا کر بھر رکھی تھی لیکن خون رُکتا نہیں تھا۔"

"کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ زخم نوکدار چاقو کا تھا؟"

"تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ زخم چاقو کا تھا" — اُس نے جواب دیا — "بہرحال ہتھیار جو بھی تھا اس کی نوک نوّے درجے کے زاویے پر ران میں گئی ہے۔"

شلوار مِل گئی

میں نے اُسے کہا کہ اُسے گواہی دینی پڑے گی۔ وہ انکار نہیں کر سکتا

تھا۔ کانسٹیبل اکمل (تنویر کے بھائی) کے گھر سے بھی واقف تھا۔ وہاں گئے۔ اُس کے باپ نے دروازہ کھولا۔ اکمل کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ کل صبح نکلا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ واردات کی رات کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُس کی بیوی کو معلوم ہوگا۔

میں اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی صحن کی دوسری طرف کے کمرے میں رہتی تھی۔ گرمیوں کی وجہ سے لوگ چھتوں پر سوتے تھے۔ میں نے اُس کی بیوی کو بلایا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ اُس سے واردات والی رات کے متعلق سوال کرنے لگا۔ اچانک مجھے کنوئیں کے رسّے کا خیال آگیا۔ میں اُٹھ کر صحن میں گیا۔ ایک کونے میں کنواں تھا۔ ڈول کا رسّہ دیکھا۔ بہت بوسیدہ حالت میں تھا۔ تین تو اس میں گانٹھیں تھیں۔ میں کمرے میں گیا اور اس کی بیوی سے پوچھا کہ واردات والی رات اکمل کس وقت گھر سے نکلا اور کس وقت گھر آیا تھا۔

"وہ شام سے پہلے ہی نکل گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "آدھی رات سے ذرا پہلے آیا تھا" — وہ فوراً چُپ ہوگئی جیسے آگے بتانا نہ چاہتی ہو کہ کیا ہُوا تھا۔ میں نے اُسے لقمہ دیا تو کچھ گھبرا گئی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا:

"اُس کی شلوار خون سے بھری ہُوئی تھی"۔

اُس نے سہمی ہُوئی سرگوشی کی — "جی"۔

"پھر تم نے وہ شلوار فوراً دھو ڈالی تھی؟"

"جی" — وہ جھجک گئی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی — "اگر آپ کو ساری بات کا علم ہے تو میری زبان سے نہ کہلوائیں۔ وہ مجھے اس

کنوئیں میں پھینک دے گا"۔

"میں تھانیدار ہوں" — میں نے کہا — "تم مجھے جو کچھ بتاؤ گی وہ میں اُسے نہیں بتاؤں گا .... اور مجھے جو کچھ بتاؤ گی اس پر وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہیں ساری بات بتانی پڑے گی۔ مجھے وہ شلوار کُرتہ دکھاؤ جو اُس نے کل رات پہنا تھا ورنہ میں سارے گھر کی تلاشی لُوں گا"۔

اکمل کے باپ کو میں نے بُلا کر کہا کہ خانہ تلاشی سے بچنا چاہتے ہو تو اسے کہو کہ میں جو مانگتا ہوں وہ مجھے دے دے۔ بوڑھے نے اُسے کہا کہ داروغہ جی کے حکم کی تعمیل کرو ورنہ یہ سب کو تھانے لے جائیں گے۔ میں نے محلّے کے دو آدمی مشیر نامہ تیار کرنے کے لیے بُلا لیے۔

اکمل کی بیوی نے شلوار اور کُرتہ نکال دیا۔ شلوار ران سے اُس جگہ سے پھٹی ہُوئی تھی جہاں اکمل کو چاقو لگا تھا۔ پھٹی ہُوئی نہیں بلکہ کٹی ہُوئی تھی۔ یہاں سے چاقو گذرا تھا۔ بیوی نے شلوار اور کُرتہ دھو ڈالا تھا مگر گھٹنوں نے گھاس پر جہاں رگڑ کھائی تھی وہاں سے گھاس کا رنگ پوری طرح نہیں اُترا تھا۔ بیوی نے یہ بیان بھی دیا کہ اکمل کی ران پر زخم تھا جس میں اُس نے سُوت جلا کر اس کی راکھ بھری تھی اور بیوی سے کہا تھا کہ کپڑے ابھی دھو ڈالے اور باہر کسی سے بات نہ کرے۔

شلوار کُرتے کی برآمدگی، بیان اور مشیر نامہ تیار کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ سُورج طلوع ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنے کانسٹیبل کو یہ کہہ کر تھانے بھیجا کہ لاش سے جو رسّہ کھولا گیا تھا وہ لے کر بازار میں آجائے۔ میں یہاں سے فارغ

ہو کر بازار گیا۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ رسّیوں کی دکان ابھی نہیں کھلی تھی۔

چند منٹ بعد دکاندار آگیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ پرسوں شام اکمل نام کے ایک آدمی نے اُس سے کتنے گز کے ڈول کا رسّہ خریدا ہے؟

اُس نے سوچ کر جواب دیا — "اکمل جو نجیب خان کا بیٹا ہے؟"

میں نے کہا — "ہاں وہی۔"

اُس نے کہا — "میں دُکان بند کر رہا تھا تو وہ اِدھر سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر رُک گیا اور کہنے لگا — 'لالہ جی! آپ کی دکان دیکھ کر یاد آگیا ہے۔ ڈول کا رسّہ بیکار ہو گیا ہے۔ تیرہ گز رسّہ دے دو۔ میں نے دکان پھر کھولی۔ لالٹین جلائی اور اُسے تیرہ گز رسّہ کاٹ دیا۔"

اتنے میں کانسٹیبل رسّہ لے کر آگیا۔ دُکاندار نے دیکھ کر کہا — "یہ میری دکان سے گیا ہے۔"

میں نے کہا — "اس کی پیمائش کرو۔" — اُس نے ناپا تو پورا تیرہ گز نکلا۔

میں تھانے گیا اور اے۔ ایس۔ آئی عثمان سے کہا کہ اکمل کے گھر کو بغیر وردی کے کانسٹیبلوں سے گھیرے میں لے لو۔ وہ جونہی اور جہاں بھی نظر آئے پکڑ لو اور سیدھا حوالات میں بند کر دو۔ میں یہ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ عورت کون تھی۔ وہ مقتول کی بہن نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ابھی ثابت کرنا تھا کہ ان کے آپس میں تعلقات ہیں۔ ہو سکتا تھا تنویر اور نادر جھوٹ کہتے ہوں۔ میں ہمیشہ کوشش کیا کرتا تھا کہ کسی مسلمان عورت کو تھانے نہ بلاؤں لیکن ان گھرانوں پر مجھے اتنا غصہ تھا کہ میں نے ان کا احترام بھی مناسب نہ سمجھا۔ وردی کے

بغیر ایک کانسٹیبل کو بھیج کر مقتول کی بڑی بہن کو بُلوا لیا۔ اُس کی ماں اور اُس کا باپ بھی ساتھ آگئے۔ انہیں میں نے الگ بٹھا دیا اور تسلّی تشفی دے کر کہا کہ خودکشی کی نفیتش مکمل کرنے کے لیے مجھے اس لڑکی کو یہاں بلانا ضروری تھا۔ چند ایک باتیں معلوم کر کے اسے آپ کے ساتھ بھیج دُوں گا۔

میں اُسے تفتیش کے کمرے میں لے گیا جہاں ایک چارپائی اور ایک کرسی رکھی تھی۔

یہ جوان عورت تھی۔ خدا نے اُسے بھی خوبصورتی دی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خوف بھی تھا اور آنسو بھی۔ اُس سے میں اکمل کے تعلقات کے متعلق، مقتول اور تنویر کے تعلقات کے متعلق اور نادر کے متعلق پُوچھنا چاہتا تھا۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے نیک اور مخلص بھائی کو اُس کی بہن نے قتل کرا دیا ہو گا۔ اکمل کے متعلق تو مجھے شک ہو رہا تھا کہ روپوش ہو گیا ہے۔ میں نے مقتول کی بہن کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور نام پوچھا تو اُس نے کہا — "توقیر"

میں نے اُس کی کلائیاں دیکھیں تو میں چونک پڑا۔ اُس کی چُوڑیاں بالکل وہی تھیں جن کے ٹکڑے مجھے کھڈ سے ملے تھے۔ ایک بازو میں تین اور دوسری میں صرف ایک تھی۔ تنویر کی چُوڑیاں بھی ایسی ہی تھیں۔ میں نے توقیر کی ایک چُوڑی والی کلائی پر ایک خراش دیکھی جو گہری سُرخ تھی۔ اس میں سے خون بھی نکلا تھا۔ میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر خراش پر اُنگلی پھیری اور پوچھا — "یہ شاید ٹوٹی ہوئی چُوڑی کا زخم ہے۔"

"بازو دیوار کے ساتھ جا لگا تھا" — اُس نے کہا۔

وہ جب بول رہی تھی میں اُس کے دانت دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اُس کا ایک طرف کا ایک دانت غائب ہے مجھے شدید جھٹکا لگا۔ چھٹے اور ساتویں دانت کے درمیان خلا تھا۔ میں نے اُس کی دونوں جُوتیاں اُتروائیں اور دفتر میں لے گیا جہاں دونوں پاؤں کے مولڈ آگئے تھے۔ دونوں جُوتیاں ان میں فِٹ آگئیں۔ واردات کے علاقے میں یہی جُوتیاں گئی تھیں۔ واپس اس کمرے میں گیا اور جُوتیاں توقیر کے آگے رکھ کر میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی تو میرا سر جُھک جاتا اور کبھی میں رُک کر اس جوان عورت کو دیکھنے لگتا۔ میں تھانیدار تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کُن وارداتیں دیکھی تھیں۔ میں نے ایک آدمی دیکھا تھا جس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا تھا۔ ایک بھائی دیکھا تھا جس نے بردہ فروشوں کی طرح اپنی سگی بہن کو بیچ ڈالا تھا۔ ایک نیک گھرانے کی پردہ نشین لڑکی کو ایک خطرناک ڈاکو جو پانچ ڈاکوں اور سات قتل کی وارداتوں میں مطلوب تھا اُس کے حق میں بیان دیتے اور اُس کی خاطر روتے دیکھا تھا۔ میں نے اپنی سروس میں ناقابلِ یقین واقعات دیکھے ہیں، مگر میں اس بہن کو یہ کہتے ڈر رہا تھا کہ کیا تم نے اپنے بھائی کو قتل کرایا ہے؟ تھانیدار کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیئے، لیکن میں جذباتی ہو گیا تھا۔

میں ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا اور اُسے بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو چکا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بھی سفیدی آگئی تھی۔ کمرے میں گرمی تھی۔ جولائی کا مہینہ تھا لیکن اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید میرے ہاتھ بھی کانپ

رہے تھے۔ میں اپنے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا "توقیر!"

اُس نے میری طرف دیکھا تو خوف سے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آگئے۔ میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ رومال نکالا جن میں چُوڑیوں کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے۔ رومال کھول کر اُس کے آگے کیا اور جُھک کر اُس کی چُوڑی والی کلائی رومال پر رکھ دی۔ نیچے میرا ہاتھ تھا۔ میں نے ٹکڑے اُس کی چُوڑی کے ساتھ ملا دیئے اور نہایت تحمل سے جس میں پیار کا رنگ بھی تھا، کہا ـــــ "توقیر! یہ تمہاری چُوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔ جانتی ہو نا مجھے کہاں سے ملے ہوں گے؟"

وہ آنکھیں پھاڑے میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

"اِن ٹکڑوں میں سے کسی ایک نے تمہاری کلائی زخمی کی ہے" ـــــ میں نے کہا۔

اُس کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ آنکھیں تو اُس کی پھٹی جا رہی تھیں۔ اُس کا منہ بھی کُھل گیا۔ مجھے اُس کے دانتوں کا خلا نظر آنے لگا۔

شریف لڑکی دھوکے میں آگئی

میں نے رومال لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور اپنا دایاں بازو آگے کر کے بازو کے اُس پٹھے پر اُنگلی رکھی جہاں مقتول کو دانت لگے تھے۔

"اس جگہ دانت رکھ کر کاٹو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "منہ سارا کھولو اور یہاں

"

سے میرا بازو منہ میں لے لو"۔

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اگر وہ چارپائی پر بیٹھی نہ ہوتی تو پیچھے کو بھاگ جاتی۔ اُس کا منہ جو ذرا سا کھُلا تھا وہ بھی اُس نے بند کر دیا۔

"کاٹو تو قبر! ڈرو نہیں"۔

میں اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اُس کے چہرے پر بکھرے ہُوئے موتیوں کی طرح پسینہ پھُوٹ آیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے اُس بازو پر رکھ دیئے جو میں نے آگے کر رکھا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ وہ میرے اُوپر گری۔ میں اُسے سہارا دینے ہی لگا تھا کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ بہانہ نہیں تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ یُوں لگتا تھا جیسے مر گئی ہو۔

میں دوڑ کر باہر نکلا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ دوڑ کر جائے اور سہول سرجن کو یہ بتا کر ساتھ لے آئے کہ ملزمہ کسی تشدّد کے بغیر بے ہوش ہو گئی ہے۔ مجھے بیان لینے ہیں، جلدی آجائے۔

مجھے ڈر تھا کہ اس عورت کے دل کی حرکت ہی بند نہ ہو جائے۔ وہ کوئی عادی مجرم یا قاتل تو نہیں تھی۔ اُس کا بھائی مارا گیا تھا خواہ اسی کے ہاتھوں مارا گیا ہو۔ اپنی چوڑیوں کے ٹکڑے دیکھ کر اور اپنے منہ کے ساتھ لگا ہُوا میرا بازو دیکھ کر اُس پر اپنی ہی واردات کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ میں اُس کے بیان لینے تک اُسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں پانی لایا۔ اُس کے منہ پر چھینٹے دیئے، چند قطرے منہ میں ٹپکائے۔ اُس کے دانت ایک دوسرے پر جام ہو

گئے تھے۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ میں دُعا کر رہا تھا کہ ڈاکٹر جلدی آجائے۔ کمرے میں پنکھا نہیں تھا۔ ایک کانسٹیبل کو بُلایا جو دستی پنکھے سے اُسے ہوا دینے لگا۔

ڈاکٹر آگیا۔ میرے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا — "کس قسم کی سختی کی ہے تاکہ میں اُس کے مطابق دوائی دوں" — وہ سمجھتا تھا شاید میں نے اُسے مارا پیٹا ہے۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ مقتول کی بہن ہے اور غالباً قاتل بھی ہے۔ یہ جُرم اور دہشت کا اثر ہے۔ ڈاکٹر نے ایک دوائی اُس کی ناک کے آگے رکھی۔ ایک دوائی کے چند قطرے اُس کے دانتوں کے خلا سے اُس کے منہ میں ڈالے۔ تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر ایک انجکشن کیا۔ آٹھ دس منٹ بعد اُس کے جسم میں حرکت پیدا ہونے لگی۔ دانتوں کا شکنجہ کُھل گیا۔ پھر اُس کی آنکھیں کُھلیں۔ گھبراہٹ صاف ظاہر تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر نے اُسے باتوں سے جذباتی سہارا دیا اور جب اُٹھ بیٹھی تو ڈاکٹر نے دُودھ منگوانے کو کہا۔ دودھ آیا تو ڈاکٹر نے اُسے ایک گولی دودھ کے ساتھ دے دی۔

"تمہیں یہاں کسی نے پریشان کیا ہو تو مجھے بتا دو.... میں سرکاری ڈاکٹر ہُوں" — ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا — "میں تمہارے بیان لکھ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ اسے کہیں ہوا میں بٹھاؤ۔ میں اُسے برآمدے میں لے گیا۔ ساون شروع ہو

چکا تھا۔ بڑی اچھی ہوا تھی۔ دوائیوں اور دودھ نے لڑکی میں جان ڈال دی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم دل سے اُتار دو کہ میں تھانیدار ہُوں۔ تمہارے سینے میں جو غبار ہے وہ نکال دو..... ایسی بہت سی باتیں کر کے میں نے اُس کے دل پر قبضہ کر لیا مگر وہ جو روئی ہے، میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیسا رونا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ ڈاکٹر مجھے ایک اور گولی دے گیا تھا۔ مجھے گولیوں کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ نشہ آور معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اُسے دوسری گولی بھی کھلا دی اور پاؤ بھر اور دُودھ پلا دیا۔

کچھ دیر بعد سنبھل گئی۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سمجھ گئی ہے کہ میرے پاس اُس کے جُرم کی ساری شہادت موجود ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ہر ایک بات جانتا ہوں اُس سے پوچھا — "اس کے بعد کل تمہیں ملا تھا؟"

اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا "نہیں" — اور اُسے گالی دے کر کہا — "اللہ کرے وہ کہیں مر گیا ہو اور اُس کی لاش کُتّے کھا رہے ہُوں"۔

میری حوصلہ افزائی اور جھوٹے وعدوں پر اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ اُس کا بیان اور بیان کے دوران میرے سوال اور اِن سوالوں کے جواب اتنی لمبی تحریر تھی کہ میں لکھ لکھ کر تھک گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ جُوں جُوں جرم کا غبار نکالتی جا رہی تھی اُس کی زبان رواں ہوتی جا رہی تھی۔ قصّہ مختصر یہ تھا کہ تنویر (مقتول کی بیوی) تو شادی سے پہلے ہی عشق و محبت کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ یہ عورت (توقیر) ایسی نہیں تھی۔ نوازش (مقتول) کی طرح مذہب پرست تو

نہیں تھی البتہ عزت اور شرافت والی تھی۔ اُس کی شادی اپنے مقتول بھائی کی شادی کے بعد ہُوئی تھی۔ خاوند اچھا تھا۔ گھر بھی اچھا تھا۔ معاشی لحاظ سے اُس کے سُسرال غریب تو نہیں تھے البتہ تھوڑا سا بھی مالی بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔

شادی کے ایک ہی سال بعد اُس کے خاوند کو دِق کا مرض لگ گیا۔ اس سے پہلے وہ اس مرض کو چھپاتا رہا تھا۔ توقیر کو پتہ چل گیا کہ ڈاکٹر نے اُس کے خاوند سے کہا تھا کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے شادی نہ کرنا۔ اُس وقت مرض ایسے ابتدائی مرحلے میں تھا جس میں وہ صرف چلتا پھرتا ہی نہیں تھا بلکہ کام کاج بھی کرتا تھا۔ اُسے ہلکی ہلکی کھانسی اور جسم ٹوٹنے کی شکایت رہتی تھی۔ اُس کے والدین کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ اسے دِق کا عارضہ ہے۔ انہوں نے اسے چھپائے رکھا اور توقیر کا رشتہ مانگ کر اس کی شادی کر دی۔

ہمارے ہاں اس قسم کی خطرناک اور احمقانہ حرکتیں آج بھی ہوتی ہیں کہ لڑکی یا لڑکا جسمانی لحاظ سے شادی کے قابل نہ ہوں تو پردہ پوشی سے کام لے کر شادی کر دی جاتی ہے۔ یہ سب "ناک" کی خاطر ہوتا ہے۔ معاشرے میں اس کے نتائج آئے دن سامنے آتے ہیں پھر بھی والدین عبرت حاصل نہیں کرتے۔

توقیر کے ساتھ یہی ظلم ہُوا۔ اُس کے دُولہا نے بھی اُسے نہ بتایا کہ وہ دق کا مریض ہے۔ اُس زمانے میں ابھی دِق کا علاج ایجاد نہیں ہُوا تھا۔ سٹریپٹومائی سین کے انجکشن اور اے۔ پی۔ ایس کی گولیاں بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ شادی ہوئی تو دُولہا میاں اپنی جسمانی حالت کو فراموش کر بیٹھے۔ چھ سات مہینوں بعد توقیر سمجھ گئی

کہ اس کا خاوند تندرست نہیں۔ وہ اب تیزی سے دِق کے جبڑوں میں جانے لگا۔ اُن دنوں وہ ایک حکیم کا علاج کرا رہا تھا۔ ایک رات توقیر نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا ہے اور وہ دوائیاں کیوں لے رہا ہے۔ خاوند ہار چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر توقیر سے کہا کہ وہ دق کا مریض ہے۔

توقیر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی لیکن شریف لڑکی تھی۔ اُس نے اتنی سخت کڑی اور ڈراؤنی حقیقت قبول کر لی اور خاوند سے کہا کہ وہ اُس کی ہر طرح خدمت اور وفا کرے گی۔ اپنے والدین سے بھی ذکر نہیں کرے گی لیکن وہ اتنا کرے کہ اُس سے دُور رہے۔ پکا وعدہ ہو گیا مگر کبھی کبھی وعدہ ٹوٹ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خاوند دِق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو گیا جس میں جراثیم پھیپھڑوں کو کھانے لگتے اور پھیلنے لگتے ہیں۔

توقیر نے اُسے ہر طرح کا پرہیز کرانا شروع کر دیا۔ اُس کے خاوند کی نوکری چھُوٹ گئی۔ وہ اب صرف چل پھر سکتا تھا۔ توقیر کا سُسر کچھ کما لاتا تھا۔ اس کے خاوند کا بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا۔ اپنے بیمار بھائی کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ گھر میں تنگدستی شروع ہو گئی۔ زیادہ تر پیسے علاج میں نکل جاتے تھے۔ ایک سال گزر گیا۔ توقیر کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ خاوند کی پوری پوری خدمت کرتی، حکیم سے اُس کے لیے دوائی لاتی، وفاداری میں اس نے کوتاہی نہیں کی، باقی ہر لحاظ سے وہ احتیاط کرتی تھی مگر مرض تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔

قتل کی واردات سے ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ توقیر حکیم سے دوائی لا رہی تھی، راستے میں اُسے اکمل مل گیا۔ اکمل اس کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اکمل کی

بہن توقیر کے بھائی (نوازش) کی بیوی تھی۔ اکمل نے توقیر سے اس کے خاوند کے متعلق پوچھا تو وہ رو پڑی اور بتایا کہ خاوند کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے اور گھر میں تنگدستی ہے۔ اکمل نے ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ توقیر کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ اُس کے خاوند کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے پہلی پیش کش یہ کی کہ نصف سیر دُودھ ہر روز بلا قیمت دینے کا وعدہ کیا۔ اُس کے گھر میں ایک گائے اور ایک بھینس تھی۔ اُسی روز وہ آدھا سیر دودھ خود لے آیا۔ پھر وہ ہر صبح اتنا ہی دودھ خود دینے جاتا رہا۔

اُسے معلوم تھا کہ توقیر تیسرے دن حکیم کے پاس دوائی لینے جاتی ہے۔ اُس روز اکمل حکیم کی دکان کے قریب موجود ہوتا۔ توقیر آتی تو اکمل بھی اس کے ساتھ دکان میں چلا جاتا اور دوائی کے پیسے دے دیتا۔ توقیر نے ابتدا میں یہ پیش کش قبول کرنے سے گریز کیا لیکن اکمل کا رویّہ ایسا مخلصانہ اور بے غرض تھا کہ توقیر نے پیش کش قبول کر لی اور اُس کی گرویدہ بھی ہو گئی لیکن نیّت میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ اکمل کی آمدنی دراصل دُودھ کی اتنی نہیں تھی، زیادہ آمدنی جُوئے کی تھی، جو وہ توقیر کے خاوند پر خرچ کرتا رہا۔ تیسرے چوتھے روز اکمل پاؤ بھر گوشت توقیر کے گھر لے جاتا اور کہتا کہ خاوند کو اس کی یخنی پلاؤ۔ توقیر ایک پاؤ گوشت کی یخنی بناتی اور تین دن خاوند کو پلاتی رہتی۔

ایک روز توقیر اکمل کے گھر گئی تو اکمل نے اُسے اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اُس کی بیوی تو بیمار بھیڑ کی مانند تھی۔ وہ اپنے کام کاج میں لگی رہی۔ توقیر نے اکمل سے کہا کہ وہ اُسے احسانات کے بوجھ تلے دباتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ

ہی اُس نے کہا کہ اگر وہ ان کی مدد نہ کرے تو گھر میں فاقہ کشی تک نوبت پہنچی ہوئی تھی۔ ذرا سی آمدنی تھی وہ حکیم اور دق کے جراثیم کھائے جا رہے تھے۔

اکمل نے مظلوموں کے لہجے میں کہا — "میں تمہیں یا تمہارے خاوند کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ یہ تو میں اپنا دل بہلا رہا ہوں۔ ذرا میری بیوی کو دیکھو۔ اس کی جگہ میں ایک اور گائے یا بھینس خرید لاتا تو دودھ تو دیتی۔ یہ عورت تو ریت کی ڈھیری ہے۔ یہ سمجھ لو کہ دن رات ریت پھانکتا ہوں۔ مجھے خدا نے درد والا اور محبت والا دل دیا ہے۔ پیسے کو تو میں کچھ نہیں سمجھتا، مجھے انسانوں سے محبت ہے۔ دل کو جو انسان اچھا لگتا ہے اُس سے پیار کی خیرات مانگتا ہوں۔ ہمیشہ خالی ہاتھ رہتا ہوں۔ میں تمہیں ایسی بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ تم عورت ذات ہو، خوبصورت بھی ہو، تم غلط سمجھ بیٹھو گی۔ پھر تم بہت دُکھی بھی ہو۔ میں کہتا ہوں مجھ سے کوئی جو چاہتا ہے لے لے، میری کھال بھی اتار لے مگر پیار کے دو میٹھے بول دے دے۔ میرا تو من ہی مر گیا ہے۔"

توقیر نے اپنے بیان میں کہا کہ اکمل نے یہ باتیں اور ایسی بہت سی باتیں ایسے دُکھے ہوئے لہجے میں کیں کہ اُسے اس پر ترس آگیا اور وہ سوچنے لگی کہ وہ اسے دلی اطمینان کس طرح دے سکتی ہے۔ توقیر پر اُس کے احسان تھوڑے اور معمولی تو نہیں تھے۔ اکمل نے اُسے صرف مالی نہیں جذباتی سہارا بھی دے رکھا تھا اور اُسے کہا کرتا تھا کہ مجھے مرد نہ سمجھا کرو، اپنی سہیلی سمجھو اور دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔ اس طرح اکمل توقیر کے اعصاب پر اور اُس کی عقل پر بڑے ہی پیارے آسیب کی طرح غالب آگیا۔ عورت کتنی ہی جابر اور مُنہ پھٹ کیوں نہ ہو وہ مرد

کی حفاظت کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ کمزوری عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ توقیر کی عمر ہی کیا تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ خاوند کے سائے میں بیٹھتی، خاوند اس کے لیے ہیبت ناک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ خیالوں کے سیلاب میں ڈوبتی رہتی تھی۔ اُس نے شادی کی خوشیاں تو دیکھی ہی نہیں تھیں۔

مقبرے کا چراغ، کھڈ کا اندھیرا

پانچ چھ مہینے اکمل اُس کی مدد کرتا رہا اور اُس کے گھر جاتا رہا۔ اُس کا خاوند بھی اُس کا مُرید بن گیا۔ خاوند کی جسمانی حالت یہ تھی کہ وہ اب چارپائی سے اُٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ توقیر نے خانقاہوں کا سہارا بھی لیا۔

قبرستان میں کسی بزرگ کا مقبرہ تھا۔ ہر جمعرات کی شام عورتیں اس میں دیئے جلایا کرتی تھیں۔ مشہور تھا کہ اس بزرگ کے پاس ہر روگ کا علاج ہے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ خواجہ خضر ادھر سے گزریں تو رات اس مقبرے میں بسر کرتے ہیں۔ اگر اُس رات کوئی دیا جلائے تو اُس کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ خواجہ خضر کونسی رات مقبرے میں آتے ہیں۔ توقیر نے خاوند کی صحت کے لیے اس مقبرے میں ہر شام دیا جلانا شروع کر دیا۔ دیا جلا کر وہ روتی اور کہتی "خواجہ خضر، اگر آپ یہاں ہیں تو میرے سہاگ کو دق سے بچاؤ یا مجھے اپنے ساتھ لے چلو"

ایسی ہی ایک شام تھی۔ توقیر نے مقبرے میں جا کر دیا جلایا۔ اُس شام وہ خاصی دیر سے گئی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ توقیر دیا جلا کر دُعا کے لیے بیٹھ

گئی۔ باہر شام اندھیری ہو گئی۔ جب وہ باہر آئی تو ڈر گئی۔ دو ہی قدم چلی تھی اکمل سامنے آ گیا۔

"اتنی دیر سے نہ آیا کرو" — اکمل نے اُسے کہا — "علاقہ ویران ہے۔ میں نے تمہیں اِدھر آتے دیکھ لیا تھا۔ اپنا کام چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس اندھیرے میں تم ڈرو گی۔"

وہ واقعی ڈر رہی تھی۔ اکمل اُس کے لیے فرشتہ بن گیا اور یہ فرشتہ اُسے بڑی ہی پُراثر باتوں میں لگائے اُس کھڈ میں لے گیا جہاں اس ڈرامے کا آخری منظر کھیلا گیا تھا۔ توقیر جوان لڑکی تھی۔ جذباتی لحاظ سے اُس میں گھُٹن تھی جو اُسے مارے جا رہی تھی۔ اکمل کے احسان کی قیمت بھی دینا چاہتی تھی۔ بہت سے عناصر جب اکٹھے ہوئے تو توقیر جو شریف اور باوفا بیوی تھی اخلاقی پستی کے گہرے کھڈ میں اُتر گئی۔

اس کے بعد تیسرے چوتھے روز توقیر دانستہ دیر سے مقبرے میں دیا جلانے جاتی اور اکمل وہاں پہنچ جاتا اور دونوں قبرستان سے پرے کھڈ میں چلے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک سال چلا۔ گناہ چھُپے نہیں رہ سکتے۔ ان کی آشنائی کے چرچے ہونے لگے۔ توقیر کے بھائی (مقتول) نے اکمل کو روکا کہ وہ توقیر کے گھر نہ جایا کرے۔ اکمل نے اُسے شرافت سے سمجھایا کہ لوگ بکواس کرتے ہیں، وہ لوگوں کی باتیں نہ سُنے مگر مقتول کی تسلی نہ ہُوئی۔ اُس نے توقیر کو بھی بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ میری بیوی بھی بدنام ہے اور میری بہن بھی بدنام ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا یا تینوں بدکاروں

کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ وہ اکمل اور توقیر کے پیچھے پڑا رہا۔ توقیر کے سامنے اکمل نے مقتول کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

اس دوران توقیر کے خاوند کی حالت آخری مرحلے میں جا پہنچی۔ عورتوں نے اُسے بتایا کہ وہ خواجہ نقشبندی کے پاس جائے۔ اُن کے تعویذوں میں بڑی برکت ہے۔ اُس قصبے میں ایک آدمی اپنے آپ کو خواجہ نقشبندی کہلاتا تھا۔ اُس کا کاروبار تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے تھا۔ سُنا تھا کہ بے اولاد عورتیں اُس سے زیادہ فیض حاصل کرتی ہیں۔ توقیر بھی ایک روز اُس کے پاس چلی گئی اور اپنے خاوند کا روگ بتایا۔ خواجہ نے اُسے تعویذ دیئے جن میں سے ایک تو گلے میں باندھنا تھا اور دوسرے دو نہار منہ پانی میں گھول کر پلانے تھے۔ خواجہ نے توقیر سے کہا تھا کہ وہ مسلسل سات روز اُس کے پاس آئے کیونکہ وہ ہر روز پینے والا نیا تعویذ دیا کریں گے۔

وہ جاتی رہی۔ اس دوران خواجہ نے اس خوبصورت لڑکی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ توقیر جھینپ گئی۔ وہ تو اس شخص کو خدا اور رسول صلعم کے بعد کا درجہ دے بیٹھی تھی مگر خواجہ نقشبندی شیطان کے روپ میں آ گیا۔

توقیر نے مجھے بتایا کہ اُس کی داڑھی اور اس کا قد بُت بالکل اُس کے مقتول بھائی نوازش سے مِلتا جُلتا تھا۔ توقیر نے اُس کے ہاں جانا چھوڑ دیا، حالانکہ وہ اکمل کے ساتھ غلط دوستی میں ڈوبی ہُوئی تھی مگر اسے وہ جائز سمجھتی تھی۔ وہ کسی اور غیر مرد سے کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

خواجہ اس کے گھر پہنچ گیا اور اس کے خاوند پر دم درُود کرنے اور تعویذ

دینے لگا۔ اداکاری خوب کرتا تھا مگر توقیر اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اُسے پتہ چل گیا کہ توقیر شام کو مقبرے میں دیا جلانے جاتی ہے۔ ایک شام اُس نے توقیر کو مقبرے کے باہر پکڑ لیا۔ توقیر نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ شور مچادوں گی۔ اس کے بعد دو دفعہ خواجہ نے اس کا پیچھا کیا اور راستے میں روکا۔ توقیر نے اکمل کو بتا دیا مگر خواجہ اکمل کے ہاتھ نہ آیا۔

پھر وہ رات کی شام آگئی۔ توقیر کو اکمل نے ایک روز پہلے کہا تھا کہ کل شام آؤں گا۔ اُس شام توقیر گھر سے اُس وقت دیا جلانے نکلی جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ مقبرے میں گئی۔ دیا جلایا اور اندر ہی انتظار کرتی رہی۔ اکمل معمول سے کچھ دیر سے آیا۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ چاند کی تیسری یا چوتھی تھی۔ چاندنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ توقیر اکمل کے ساتھ کھڈ کی طرف چل پڑی۔ اکمل کے ہاتھ میں رسّہ تھا۔ توقیر کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کنوئیں کا رسّہ بالکل خراب ہوگیا ہے۔ بازار سے گزر رہا تھا تو رسّہ خرید لیا پھر یاد آیا کہ تم انتظار کر رہی ہوگی۔ میں گھر نہیں گیا، سیدھا اِدھر ہی آگیا۔

وہ قبرستان سے نکل کر دوسرے راستے سے کھڈ کی طرف جا رہے تھے کہ توقیر نے چونک کر کہا — "کوئی آرہا ہے"۔

اُسے کسی کے قدموں کی آواز سُنائی دی تھی جو دُور تھی۔ اکمل نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پھیکی پھیکی چاندنی میں اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

توقیر نے اُسے کہا — "کوئی ہُوا بھی تو وہی خواجہ ہوگا، تعویذوں والا۔ مردُود نے پریشان کر دیا ہے"۔

اکمل نے کہا — "اگر اس وقت سامنے آگیا تو بچ کے نہیں جائیگا"۔

بہن کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں

وہ آہستہ آہستہ چلتے کھڈ تک پہنچے اور کھڈ میں اُتر گئے۔ دو ہی منٹ بعد توقیر کو کھڈ کے اُوپر ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ اکمل کی اُس طرف پیٹھ تھی کھڈ کے اُوپر جھاڑیاں بھی تھیں۔ چاندنی بہت ہی مدھم تھی۔ آسمان کے پس منظر میں وہ داڑھی اور قدبُت خواجہ نقشبندی کا تھا۔ توقیر نے اُسے کھڈ پر آکر رکتے اور ایک ثانیے میں بہت تیزی سے نیچے اُترتے دیکھا۔

"اکمل" — توقیر نے چلّا کر کہا — "وہ مردُود آگیا ہے" — اندھیرے میں توقیر نے اُس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا۔ اکمل گھوما اور پھُرتی سے وار بچانے لگا۔ چاقو اُس کی ران میں لگا۔ حملہ آور اُوپر سے بہت تیزی سے آیا تھا۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ اکمل سے ٹکرایا تو اکمل گر پڑا۔ حملہ آور اس پر سوار ہوگیا۔ اُس وقت توقیر اُسے خواجہ نقشبندی سمجھ رہی تھی۔ خواجہ نے گرے ہُوئے اکمل کی پیٹھ پر بیٹھ کر چاقو والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ توقیر نے ایک ہی جست میں آگے ہو کر حملہ آور کا بازو کہنی کے نیچے سے منہ میں لے لیا اور خواجہ کے خلاف اس کے دل میں جتنی نفرت اور جتنا غصّہ تھا وہ دانتوں میں اتار دیا اور اس قدر زور سے کاٹا کہ خواجہ بلبلا اُٹھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ توقیر نے اُسے پرے دھکیل دیا۔ اکمل اُٹھ کھڑا ہُوا۔

اُن میں ایک آدھ منٹ لڑائی ہُوئی۔ توقیر نے حملہ آور کو پیچھے سے ٹخنے سے پکڑا اور اُس کی ٹانگ اُٹھا کر مروڑ دی۔ حملہ آور نے توقیر کی کلائی پکڑ کر مروڑی تو چُوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ پھر اُس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ وہ پیٹھ کے بَل گرا۔ اکمل اُس کے سینے پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبا لی۔ چُوڑی کے ایک ٹکڑے نے توقیر کی کلائی زخمی کر دی اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا حملہ آور کی مُٹھی میں رہا اور موت نے اُس کی مٹھیاں کھُلنے نہ دیں۔

ذرا سی دیر بعد حملہ آور کی حرکت بند ہو گئی۔ اکمل نے اُسے چھوڑ دیا اور گالی دے کر کہا ــــ "چڑیا جتنا آدمی ہے۔ مر ہی نہ گیا ہو" ــــ اُس نے ماچس جلائی۔ روشنی ہُوئی تو توقیر کی چیخ نکل گئی۔ وہ تو اُس کا اپنا بھائی نوازش تھا۔ اُس کی داڑھی اور قدبُت خواجہ نقشبندی کے مشابہ تھا۔ چاندنی بہت ہی مدھم تھی اور کھڈ میں تو اور کم نظر آتا تھا۔ اکمل بھی اُسے خواجہ سمجھتا رہا۔

توقیر اپنے بھائی پر گر پڑی۔ اُس نے اکمل کے سر اور منہ پر دو ہتڑ مارے۔ اُس کا بھائی مر چکا تھا۔ اکمل کی ٹانگ سے اور نوازش کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ توقیر تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ چڑیلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اکمل کے بھی ہوش اُڑ گئے۔ اس نے روتی چلاتی توقیر کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا ــــ "اب ہوش میں آؤ۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ تم بھی قاتل ہو میں بھی قاتل ہوں۔ دونوں پھانسی چڑھیں گے اور دونوں کے گھروں کی رُسوائی ہو گی"۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ قریب ہی وہ رسّہ پڑا تھا جو اکمل اپنے کنوئیں کے لیے خرید لایا تھا۔ رسّے کو دیکھ کر اُس نے کہا ــــ "ایک طریقہ دماغ میں آیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اس (نوازش) کی بیوی بدچلن ہے اور سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ نوازش بہت پریشان رہتا تھا۔ تم یہیں سے گھر چلی جاؤ۔ میں اس کی لاش کے گلے میں پھندا ڈال کر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دُوں گا۔ لوگ کہیں گے کہ اس نے بیوی سے تنگ آ کر خودکُشی کر لی ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم دونوں پھانسی چڑھیں گے"۔

بہن کس طرح برداشت کرتی کہ اُس کے بھائی کی لاش درخت کے ساتھ لٹکا دی جاتی۔ وہ تو رو رو کر پاگل ہُوئی جا رہی تھی۔ اکمل نے کُرتے کی جیب سے ایک سگریٹ نکالا۔ اس میں کچھ رکھ کر ماچس جلائی اور اسے آنچ دے کر تمباکو میں ملایا اور تمباکو سگریٹ میں ڈال کر سگریٹ سُلگایا۔ توقیر کو معلوم نہیں تھا کہ یہ چرس ہے اکمل نے سگریٹ توقیر کو دے کر کہا کہ ہلکا سا کش لے کر دُھواں اندر لے جاؤ۔

اُس نے کش لگایا تو اُسے کھانسی اُٹھی۔ اکمل نے آہستہ آہستہ اُسے سگریٹ پلایا۔ چرس نے رنگ دکھایا۔ توقیر پر نشہ طاری ہو گیا۔ رونا چیخنا بند ہو گیا اور اُس پر کچھ اور ہی مُوڈ طاری ہو گیا۔ اُس نے اکمل سے کہا ــــ "اُٹھو۔ لاش کو اُٹھائیں اور کہیں لٹکا دیں"۔

اکمل نے اُسے کہا کہ وہ گھر چلی جائے اور زبان بند رکھے۔ اکمل نے سوچ سوچ کر کہا ــــ "قبرستان کے پاس پیپل کا ایک درخت ہے۔ اس پر میں لاش کو اُٹھا کر چڑھ جاؤں گا"۔

اُس نے لاش دونوں کندھوں پر ڈالی۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل کھڈ کی ڈھلان چڑھا۔ اُوپر جا کر توقیر سے کہا کہ رسّہ دے دو۔ توقیر نے لپٹا ہُوا رسّہ

اُسے دے دیا۔ اکمل قبرستان کی طرف چل پڑا۔ پھر تالاب کے نشیب میں اُتر گیا۔ توقیر وہاں تک اُس کے ساتھ گئی۔ اکمل نے رُک کر اُسے کہا —— "تم گھر پہنچو۔ واپس جاؤ۔ ڈرنا مت۔ گھر والے پوچھیں تو کہنا کہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔"

وہ وہیں سے واپس چلی گئی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں کہ اکمل نے لاش کس طرح پیپل پر چڑھ کر لٹکائی۔ وہ گھر گئی۔ چرس کے نشے نے اُس کے دل اور دماغ سے اتنے زبردست حادثے کا اثر اُتار دیا تھا۔ گھر والوں کو اُس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کو دیکھنے چلی گئی تھی۔ صبح اُس کی آنکھ اُس وقت کُھلی جب ساس اُسے جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی اور کہہ رہی تھی —— "اری اُٹھ، تیرے تو کرم ہی جل گئے ہیں۔ تیرے بھائی نے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی لے لی ہے۔"

وہ چیخیں مارتی اُٹھی۔ چرس کا نشہ ختم ہو چکا تھا۔ حقیقت سامنے آگئی تھی۔ وہ چڑیلوں کی طرح چیختی باہر کو دَوڑ پڑی۔ اُس نے قبرستان میں جا کر بھائی کی لاش پیپل سے لٹکتی دیکھی۔ پہلے بے ہوش ہوئی۔ ہوش میں آئی تو اُس نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ ہاتھ مار مار کر اپنا چہرہ لال کر دیا۔ اب جبکہ ہر کوئی رو رہا تھا، توقیر کے رونے اور پیٹنے پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ دن میں دو بار بے ہوش ہُوئی۔ کسی کو اُس پر شُبہ نہ ہُوا۔ میرے پاس آکر بھی بے ہوش ہوئی۔ مجھے یہ ڈر لگا رہا کہ توقیر پھر بے ہوش نہ ہو جائے مگر اتنا لمبا بیان دے کر وہ نارمل رہی۔ ایک تو سینے کا غبار یعنی جُرم کا بوجھ اُتر گیا تھا دوسرا اثر ڈاکٹر کی گولیوں کا تھا مگر گولیوں کا اثر بھی ختم ہو گیا۔ اُس نے اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے۔ میں نے اُسے

بہلانے کی کوشش کی لیکن ناممکن تھا۔ اُس کا بھائی اُس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میں اُسے مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر بیان ریکارڈ کرانا چاہتا تھا مگر اُس نے مہلت نہ دی۔ اُسے حوالات میں بند کیا تو اندر جاتے ہی اُس نے دروازے کی سلاخوں سے سر مارنا شروع کر دیا۔ اُس کا ماتھا لہولہان ہو گیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے بندھوا کر پیٹھ کے بل فرش پر ڈال دیا۔ اُس نے سر اُٹھا اُٹھا کر اتنی زور زور سے فرش پر مارا کہ تھانہ ہل گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

یہ الزام مجھ پر آتا تھا کہ میں نے تھانے میں اس سے بیان لینے کے لیے اسے ٹارچر کیا ہے۔ میں نے سول سرجن کو بلوایا اور خود مجسٹریٹ کے پاس دوڑ گیا۔ قصبے میں درجہ اوّل مجسٹریٹ نہیں ہوتا تھا۔ ایک سول سب جج اور ایک آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ میں نے دونوں کو یہ واردات سنائی۔ دونوں تھانے میں آگئے۔ ڈاکٹر بھی آگیا۔ لڑکی کو ہسپتال لے گئے، لیکن وہ پاگل ہو چکی تھی۔ اپنے بھائی کو بڑی زور زور سے پکارتی تھی اور کہتی تھی —— "نوازش آجا۔ دونوں اکمل کی لاش کو لٹکائیں گے" —— کبھی قہقہے لگاتی اور کبھی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتی۔

اگر وہ پاگل نہ ہوتی تو میں اسے شک میں بری کرانے کی کوشش کرتا۔ وہ مظلوم لڑکی تھی۔ دھوکے سے اُسے دِق کے مریض کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ وہ شریف اور وفادار رہی مگر تنگدستی نے خاوند کی تیمارداری نے اور ایک شیطان کے جھُوٹے خلوص نے اُسے عزت اور عصمت سے بھی محروم کر دیا۔ پھر خواجہ نقشبندی نام کے ایک نوسرباز نے اُسے جال میں پھانسنے کی کوشش کی اور

اُس کے دھوکے میں اس کے بھائی کا خون ہوگیا۔

نقشبندی ــــ عورتوں کا شکاری

اُسی شام اکمل پکڑا گیا۔ وہ جُوئے کے اڈے سے پکڑا گیا تھا میں تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن اس آدمی کو پچھلے کمرے میں لے جاکر میں نے گھونسوں سے اس قدر پیٹا کہ میری مٹھیاں اور میرے کندھے درد کرنے لگے۔ پھر بھی میرا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے بے حال کرکے میں نے کہا ــــ "تم اقبالی بیان دو نہ دو میرے پاس پوری شہادت موجود ہے"۔

توقیر جو جُرم کی معاون اور نہایت اہم گواہ تھی پاگل ہو چکی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کیس چوپٹ ہوگیا ہے۔ میں نے اکمل کو نہیں بتایا کہ توقیر پاگل ہوگئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ توقیر اقبالِ جُرم کر چکی ہے اور یہ اُس کا بیان ہے۔ میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ میرے پاس کیا کچھ ہے۔

اُس نے صرف اتنا کہا ــــ "اگر میں بھی اقبالِ جُرم کر لوں تو عالی جاہ مجھے کچھ فائدہ دیں گے؟"

میں نے جھوٹا وعدہ کیا اور اُس نے اقبالی بیان دے کر توقیر کے بیان کی تصدیق کر دی۔

نادر اور تنویر کو میں نے آزاد کر دیا لیکن نادر کے باپ کو تھانے بُلایا۔ اُسے اندر لے جاکر خوب ذلیل کیا اور اُسے کہا کہ تمہاری ان سفید ٹوپیوں، کلف لگے کُرتوں اور پاجاموں میں غلاظت بھری ہُوئی ہے۔ تمہاری سفید پوشی میں سیاہ کالے دِل لپٹے ہُوئے ہیں۔ شرم کرو اور غیرت کو پہچانو۔ میں تھانیداری کے رُعب سے کچھ نہیں کرا سکتا۔ میرا ایمان مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تمہیں شرم دلاؤں۔ یُوں کرو کہ یہ کیس ذرا رفع ہو جائے تو اِن دونوں (نادر اور تنویر) کو آپس میں بیاہ دو، ورنہ یہ لڑکی ساری عمر ذلیل ہوتی رہے گی اور تمہارا بیٹا کبھی شادی نہیں کرے گا۔ پھر تمہارے ہاں معلوم نہیں کتنے اور قتل ہوں گے اور کتنی اور کالک تمہاری سفید داڑھی پر مل جائے گی۔

اکمل کے خلاف میں نے نہایت کامیابی سے استغاثہ بنایا۔ مقتول کے کپڑوں پر جو خون تھا اس کی رپورٹ بھی آگئی تھی۔ یہ دو مختلف گروپوں کے خون تھے۔ میں نے اکمل کا خون بھجوایا تو اس کا گروپ ایک گروپ سے مل گیا۔ توقیر کی قسمت میں پاگل خانہ لکھا تھا۔ اُسے کورٹ میں اسی حالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اُس کی گواہی نہیں لی جا سکتی تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ لڑکی اس حادثے سے پاگل ہوئی ہے۔ وہ بے چاری پاگل خانے میں ہی مر گئی ہوگی۔ اکمل کو سزائے موت دی گئی۔ اپیل کی تو ہائی کورٹ نے مسترد کر دی اور سزائے موت برقرار رکھی۔

میں خواجہ نقشبندی کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک تو میں بچپن سے ہی پیر پرستی اور تعویذوں ٹوٹکوں کے خلاف ہوں، دوسرے یہ کہ یہ نوسر باز ایک نیک اور پارسا آدمی کے قتل کا باعث بنا تھا۔ میں اُسے بلاوجہ گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے مسلمان بہن بھائی ایسے پیروں اور بزرگوں کی کرتُوت کو جُرم سمجھتے

ہی نہیں۔ میں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ سمگلروں کو اور چرس افیون وغیرہ غیرقانونی طریقے سے بیچنے والوں کو بوگس گاہک بھیج کر پکڑا جاتا ہے۔ انہیں بوگس پرچیزر کہتے ہیں۔ پولیس اور عدالتوں والے انہیں بی پی کہتے ہیں۔

میں نے خواجہ صاحب کو پھانسنے کے لیے قصبے کے دو بدمعاشوں کے ذریعے ایک بدمعاش لڑکی بلائی جو عصمت فروشی کرتی تھی۔ چھوٹا سا مکان لیا۔ اس لڑکی کو پہلے ٹریننگ دی۔ بدمعاشوں کو بھی تیار کیا۔ پھر لڑکی کو سائل کی حیثیت سے یعنی بوگس پرچیزر بنا کر خواجہ کے پاس بھیجا۔ لڑکی نے اُس سے اولاد مانگی۔ خواجہ صاحب مست ہو گئے۔ لڑکی نے کہا کہ میرے گھر چلیں۔ خواجہ صاحب بُوگیر کُتّے کی طرح وہاں چلے گئے جہاں میں نے پھندا لگا رکھا تھا۔ دیر بعد محلے والوں کو ایک لڑکی کی چیخیں سنائی دیں۔ میرے بدمعاش گھات میں تھے۔ وہ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر دیواریں کُود کر اندر گئے۔

لڑکی نے اپنی شلوار پھاڑ رکھی تھی اور اُتاری ہُوئی تھی۔ اپنے ہی ناخنوں سے اُس نے اپنے چہرے پر خراشیں ڈال لی تھیں۔ خواجہ نقشبندی صاحب عُریانی کی حالت میں تھے۔ پکڑے گئے اور سیدھے تھانے لائے گئے۔ میں بھرا بیٹھا تھا۔ رات بھر کانسٹیبلوں سے اُس کا جو حشر کرایا اُس نے مرتے دم تک یاد رکھا ہوگا۔ میں نے اُس کے خلاف زبردستی آبروریزی، دوسرے گھر میں ناجائز مداخلت اور نوسربازی کی دفعات لگا کر شہادتیں تیار کیں۔ خواجہ صاحب کو ہتھکڑی لگا کر بازار سے گزارا۔ مسلمانوں کو دکھایا۔

اس مقدمے کا فیصلہ یہ ہُوا، آبروریزی سات سال قید بامشقت۔ ناجائز

مداخلت پانچ سال اور نوسربازی پانچ سال مگر مجھے بتایا گیا کہ قصبے کے مسلمان کہتے ہیں کہ اس تھانیدار کا ککھ نہیں رہے گا۔ اس دُنیا میں سزا پائے گا اور کوڑھی ہو کر مرے گا۔

آج میری عمر چار کم اسّی سال ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ تندرست و توانا اور برسرِروزگار ہیں۔ میں خود بھی تندرست ہوں اور ذاتِ باری تعالیٰ سے یہی اُمید ہے کہ اپنی تفتیشوں کی آخری کہانی بھی سُنا کر مروں گا۔

○○○

فرار کے راستے

نولکھا ہار کی چوری کی کہانی آپ نے بہت پرانی کتابوں میں پڑھی ہوگی۔ میری جوانی کے دَور میں اس کی فلم بھی بنی تھی۔ یہ بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کی دنیا کی خیالی کہانی تھی۔ میں آپ کو ایک حقیقی ہار کی چوری کی واردات سُناتا ہوں۔ یہ راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی نہیں بلکہ اُن گھرانوں کی کہانی ہے جہاں باپ اپنی بیٹیوں کے لیے سونے کا ہلکا سا ہار ساری عمر کی محنت اور مشقت سے اور پیسہ پیسہ کر کے جمع کی ہُوئی پُونجی سے بنایا کرتے ہیں اور جہاں کوئی بیٹی اُس وقت تک بیاہی نہیں جاتی جب تک اُس کا باپ اپنا خون، اپنا سکون اور اپنی نیندیں سونے کے ایک ہار کی صورت میں اپنی بیٹی کے گلے میں نہیں ڈالتا۔ اگر سونے کا یہ ہار جس کی چمک میں ایک غریب باپ کے خون کی لالی ہو چوری ہو جائے تو وہ باپ خودکُشی نہ کرے تو باؤلا ضرور ہو جائے گا۔

ایسا ہی ایک باپ میرے تھانے میں آیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا بڑھاپے کے اثرات تو تھے ہی، اُس کی آنکھوں میں مجھے ذرا سی بھی چمک

نظر نہیں آ رہی تھی جیسے موت نے اس کی آنکھوں کو نُور سے محروم کر دیا ہو۔

"میرے گھر سے سونے کا ہار اور کچھ نقدی چوری ہو گئی ہے"— اُس نے کہا۔

"کب؟"

"پانچ چھ روز ہو گئے ہیں"— اُس نے جواب دیا۔

"آپ کو آج پتہ چلا ہے کہ چوری ہوئی ہے؟"

"میں آپ کو چوری کا صحیح دن اور وقت نہیں بتا سکتا"— اُس نے کہا— "پانچ چھ روز ہُوئے پتہ چلا کہ ٹرنک سے سونے کا ہار اور نقدی (تین سو روپے) غائب ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کب، کس وقت اور کس طرح کوئی ہاتھ صاف کر گیا۔"

"میرے پاس آپ اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"میں اپنے طور پر چوری کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا رہا"— اُس نے جواب دیا— "ہم نے چور کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ عورت ہے۔ مانتی نہیں۔ ثبوت ایسا ملا ہے جسے کوئی جُھٹلا ہی نہیں سکتا۔"

"مجھے ثبوت بتائیں۔"

"اُس کے نام پر لوٹا گھوم گیا تھا"— اُس نے جواب دیا— "ہم نے اپنے مولوی صاحب کو بلایا تھا۔ وہ لوٹے کا عمل کرتے ہیں۔ اس عورت کی پرچی لوٹے میں پڑی تو لوٹا گھوم گیا۔ سب نے دیکھا۔"

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاں لوٹے کے ذریعے چوری

کا سراغ لگانے کا طریقہ عام اختیار کیا جاتا ہے۔ دیہات میں اس کا رواج زیادہ ہے۔ چوری کا سراغ لگانے کے اس قسم کے طریقے برصغیر پاک و ہند کے بعد افریقہ کے حبشی قبائل میں رائج ہیں۔ لوٹے کا عمل اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک عامل کو بلایا جاتا ہے۔ وہ مٹی کا لوٹا لے کر آتا ہے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اسے ایک لڑکا دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھتا ہے۔ جن افراد پر چوری کا شک ہو انہیں اردگرد بٹھا لیا جاتا ہے۔ عامل کچھ پڑھتا ہے۔ پھر ایک مشتبہ فرد کے نام کی پرچی لوٹے میں ڈالتا ہے۔ اگر لوٹے میں کوئی حرکت نہ ہو تو یہ فرد شک سے بری سمجھا جاتا ہے۔ لوٹے سے اُس کی پرچی نکال لی جاتی ہے۔ دوسرے فرد کے نام کی پرچی ڈالی جاتی ہے۔ اگر چور مشتبہ افراد میں موجود ہے تو جونہی اُس کے نام کی پرچی لوٹے میں پڑتی ہے لوٹا تھوڑا سا گھوم جاتا ہے۔

میں ایسی کوئی رائے نہیں دوں گا کہ لوٹا چور کی پرچی پر واقعی گھومتا ہے یا نہیں۔ میں نے لوٹا گھومتے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تھانیدار تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ چوری کی یا کسی اور واردات کی رپورٹ آتی تھی تو میرا سر لوٹے کی طرح گھومنے لگتا تھا لیکن یہ پتہ چلانا محال ہوتا تھا کہ اسے کونسے مجرم کی پرچی گھما رہی ہے۔ یہ آدمی چوری کی رپورٹ دینے آیا تو مجھے یہ سُن کر ذرہ بھر اطمینان نہ ہُوا کہ لوٹے نے چور کا سراغ لگا لیا ہے۔ میرے لیے لوٹا کوئی شہادت نہیں تھی۔ قانون لوٹے کو تسلیم نہیں کرتا۔

"میں ثبوت پوچھ رہا ہوں" — میں نے کہا — "میں لوٹے کی گواہی پر

اس عورت کو گرفتار نہیں کر سکتا۔"

"حضور! سات عورتوں کے سامنے لوٹا گھوما تھا" — اُس نے کہا — "مولوی صاحب گواہ ہیں۔ وہ ہماری مسجد کے امام ہیں۔ امام تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ آپ اُن سے پوچھ لیں۔ میں نے اور مولوی صاحب نے اس عورت سے کئی بار کہا ہے کہ وہ ہار اور نقدی دے دے اور ہم خاموش رہیں گے، پولیس کو رپورٹ نہیں کریں گے مگر وہ لڑنے پر آجاتی ہے۔ مولوی صاحب کا بھی کہا نہیں مانتی۔ اس کے خاوند کو بھی ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا ہے۔ آپ ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ہمارا مال برآمد ہو جائے گا۔ آپ اس عورت اور اس کے خاوند کو تھانے بلا کر ذرا رُعب سے کہیں تو وہ مال دے دیں گے۔"

مولوی کا شک عورت پر

"مال کہاں تھا؟" — میں نے کہا — "مجھے اچھی طرح بتائیں۔"

"ایک ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے زیورات کے ڈبے پڑے تھے" — اُس نے کہا — "یہ میں نے اپنی بڑی بیٹی کے لیے اپنا پیٹ باندھ کر بنائے ہیں۔ ان میں ہار سب سے زیادہ قیمتی تھا۔ اسی ڈبے کے نیچے دس دس روپے کے نوٹوں کی صورت میں تین سو روپیہ رکھا تھا۔"

"صرف ہار اور نوٹ چوری ہوئے ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "باقی ڈبّے بالکل محفوظ پڑے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ کپڑوں کو دیکھو جو تہہ کیے ہوئے ان ڈبوں پر پڑے تھے اُسی طرح پڑے دیکھے جیسے انہیں کسی نے چھیڑا ہی نہیں۔"

"ٹرنک کو تالا لگا ہُوا تھا؟"

"جی ہاں!" — اُس نے حیرت کا اظہار کرتے ہُوئے کہا — "تالا لگا ہُوا تھا۔ توڑا نہیں گیا۔ کسی دوسری چابی سے کھولا گیا ہوگا۔"

"یہ ٹرنک کسی ایسی جگہ پڑا تھا جہاں باہر کا کوئی آدمی یا کوئی عورت اسے آسانی سے کھول سکتی تھی؟"

"ایسی بات بھی نہیں" — اُس نے کہا — "یہ ٹرنک اندرونی کمرے میں رکھا ہُوا تھا۔ اس کے اُوپر ایک ٹرنک، اس پر ایک سوٹ کیس اور اس پر ایک اور سوٹ کیس رکھا تھا۔"

"یہ نیچے پڑے ہوئے تھے؟"

"نہ جی!" — اُس نے جواب دیا — "زیور والے ٹرنک کے اُوپر ہی پڑے رہے۔ چور نے پورے اطمینان سے واردات کی ہے۔ اوپر سے ٹرنک اور سوٹ کیس اُتارے۔ زیورات والا ٹرنک اپنی چابی سے کھول کر ہار والا ڈبہ اور نوٹ نکالے۔ تالہ بند کیا۔ اُتارے ہوئے ٹرنک اور سُوٹ کیس اُوپر رکھے اور گیا۔"

"آپ کو چوری کا پتہ کس طرح چلا؟"

"میری بیوی نے کچھ اور پیسے اس ٹرنک میں رکھنے کے لیے

ٹرنک کھولا تو چوری کا پتہ چلا" — اُس نے جواب دیا۔

"اس سے چند دن پہلے آپ اپنے گھر کے تمام افراد سمیت کہیں باہر گئے تھے؟" — میں نے پوچھا — "مکان کو ایک دو روز یا اس سے زیادہ دن تالا لگا رہا؟"

"میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک رشتہ دار کی شادی پر گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "لیکن گھر کو تالا نہیں لگایا گیا کیونکہ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یہیں تھیں۔"

"ان کی عمریں کیا ہیں؟"

"بڑے بیٹے کی عمر پچیس سال کے قریب ہے" — اُس نے جواب دیا — "اس سے چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی عمر اکیس سال ہو چکی ہے۔ اس سے چھوٹی ایک اور بیٹی ہے۔ عمر سترہ سال اور اس سے چھوٹا ایک اور بیٹا ہے جس کی عمر چودہ سال ہے۔"

"گھر میں پردہ ہے؟"

"سخت پردہ" — اُس نے جواب دیا — "اتنا سخت کہ میں اپنی بیٹیوں کو باہر نہیں جانے دیتا۔"

"اور بیٹے؟" — میں نے پوچھا — "اُن پر آپ نے کسی قسم کی سخت پابندی عائد کر رکھی ہے؟"

"آپ میرے بیٹوں پر شک نہ کریں" — اُس نے جواب دیا — "وہ گھر میں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔"

"آپ میرے پاس رپورٹ لے کر آئے ہیں" — میں نے کہا — "مجھے اس سے نہ روکیں کہ میں کس پر شک کرتا ہوں اور کیا شک کرتا ہوں۔ میں آپ کے شکوک کی پابندی نہیں کروں گا۔ آپ جوان بیٹوں کے متعلق مجھے نہ بتائیں کہ اُن پر میں شک کروں یا نہ کروں۔"

"کسی اور پر شک کی ضرورت اس لیے نہیں کہ میں چور کی نشاندہی کر رہا ہوں" — اُس نے کہا — "آپ اُسے پکڑیں۔"

"کیا اس عورت کے آپ کے گھر والوں کے ساتھ تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ اُسے یہ بھی علم ہو کہ آپ نے زیورات کہاں رکھے ہوئے ہیں؟" — میں نے پوچھا — "وہ آپ کے گھر صبح و شام آتی رہتی ہے؟"

"اتنی زیادہ تو نہیں آتی" — اُس نے جواب دیا — "اور میرا خیال ہے کہ اُسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہم نے کیا کہاں رکھا ہوا ہے۔"

"آپ نے اسے کس شک کی بنا پر لوٹے کے عمل کے لیے بلایا تھا؟"

وہ ذرا سٹپٹایا اور بولا — "میں نے نہیں مولوی صاحب نے اُسے بلایا تھا۔"

یہ پیشِ نظر رکھیے کہ لوٹے کے عمل کے لیے اُن مردوں اور عورتوں کو بلایا جاتا ہے جن پر شک ہو۔ انہیں کسی بہانے سے بلایا جاتا ہے۔ بعض لوگ صاف بتا دیتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہمارے گھر آؤ، جسے بلاؤ وہ دل میں کتنی ہی شدید ناراضگی کیوں نہ رکھے وہ آنے سے انکار نہیں کرتا۔ اس آدمی کو اس عورت پر شک نہیں تھا جس کا وہ بار بار نام لے رہا تھا۔ اس

کے بیان کے مطابق مولوی صاحب آئے تو انہوں نے اپنے اُوپر مراقبے کی کیفیت طاری کر کے کہا کہ چور ان میں نہیں ہے۔ انہوں نے اس عورت کے گھر کی سمت اور ایک دو نشانیاں بتا کر کہا کہ چور وہاں ہے اور وہ عورت ہے۔ چنانچہ اس عورت کو بلایا گیا اور لوٹا اُسی کی پرچی پر گھوما۔

وہ میرا اشارہ نہ سمجھا

میں اس آدمی کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ میں جو سوچ رہا تھا وہ یہ تھا کہ اتنے زیورات میں سے صرف ہار گیا اور نقدی۔ ٹرنک کے اُوپر ٹرنک اور سوٹ کیس جس طرح رکھے تھے اسی طرح رکھے رہے۔ تالا توڑا نہیں گیا۔ نقب نہیں لگی۔ گھر خالی بھی نہیں تھا۔ میرے مزید کریدنے پر اس آدمی نے بتایا کہ گھر میں نوکر یا نوکرانی بھی نہیں ہے۔ گھر میں محلے کی جو عورتیں آتی ہیں وہ ٹرنکوں والے کمرے تک نہیں جا سکتیں۔ اس سے میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ چور گھر میں ہے۔ اسی شک کی بنا پر میں نے اس کی اولاد کی عمریں پوچھی تھیں۔

چوری کی یہ واردات اس آدمی کے لیے نئی اور حیرت انگیز تھی، میرے لیے اور کسی بھی تھانیدار کے لیے یہ کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ وہ جتنا پریشان تھا میں اتنا ہی مطمئن تھا۔ اُسے شاید معلوم نہیں تھا کہ پولیس والے صحیح معنوں میں حیران کُن واردات کو بھی حیران کُن نہیں سمجھا کرتے۔

"آپ میری رپورٹ لکھ لیں"— اُس نے کہا— "اور کارروائی کریں۔"

"میں کارروائی شروع کر دیتا ہوں"— میں نے کہا— "لیکن میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ رپورٹ نہ لکھوائیں۔"

"آپ مجھے ٹال رہے ہیں"— اُس نے کہا— "آپ کو یہ احساس نہیں کہ میں نے کس طرح بیٹی کے لیے یہ زیورات بنوائے ہیں۔ میں غریب آدمی ہوں۔"

آپ شاید حیران ہو رہے ہوں کہ ایک معمولی سا شہری ایک تھانیدار کو رُعب سے کہہ رہا تھا کہ اُس کی رپورٹ لکھی جائے۔ اُس دَور میں (جب ہم آزاد نہیں تھے) ہر شہری اپنا حق سمجھتا تھا کہ تھانیدار اُس کی بات سُنے اور قانون کے مطابق کارروائی کرے۔ بعد میں کیس میں گڑبڑ ہو جانا اور بات تھی، کوئی تھانیدار کسی شہری کو اُس کے حق سے محروم کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پولیس والے دوسری پارٹی سے "چائے پانی" وصول کر کے ہیرا پھیری کرنا چاہتے تو بعد میں کر لیا کرتے تھے۔ پولیس کسی بھی دَور میں ہیرا پھیری اور چائے پانی سے پاک نہیں رہی لیکن یہ حال کبھی نہیں ہُوا تھا جو آج اپنے ملک میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اکثر تھانیداروں کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ رپورٹ رجسٹر نہ کی جائے اور رپورٹ درج کرانے والے کو کسی نہ کسی طرح بھگا دیا جائے۔

تھانیداروں کی اس بے رُخی کی ایک وجہ یہ ہے کہ جرائم اتنے بڑھ گئے ہیں کہ شہروں کے ہر تھانے کے علاقے میں ہر گھنٹے بعد ایک واردات

ہوتی ہے۔ تھانیدار کتنی وارداتیں سنبھال سکتے ہیں! ہمارے وقتوں میں جرائم کی یہ بھرمار نہیں تھی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت سیاسی پارٹیوں کے پالے ہوئے غنڈوں کی فوج نہیں ہُوا کرتی تھی۔

یہ آدمی جس کے گھر سے ہار چوری ہو گیا تھا اصرار کر رہا تھا کہ میں اس کی رپورٹ درج کروں لیکن میں ٹال رہا تھا۔ میں کارروائی سے گریز نہیں کر رہا تھا۔ ٹالنے کا جو جواز تھا وہ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ میرے مسلمان بھائی ہیں"— میں نے اُس سے کہا— "میں آپ کو چور پکڑ دوں گا لیکن اس واردات کو تھانے کے ریکارڈ میں نہ آنے دیں۔"

وہ میرے اشارے سمجھ نہیں رہا تھا۔ گھوم پھر کر مولوی کے لوٹے پر آ جاتا اور کہتا کہ میں اس عورت کو ڈرا دھمکا کر اُس سے مال دلا دوں اور اگر وہ نہ دے تو اُسے گرفتار کر لوں مگر چوری کی نوعیت ایسی تھی کہ میرا دماغ گھوم پھر کر اُس کے گھر پہنچ جاتا اور کہتا کہ ہار اسی گھر میں ہے۔ میں غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کا یا اپنا وہم دُور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اُس کے گھر جاؤں۔ اُس کے اصرار پر میں نے رپورٹ درج کر لی اور اس کے ساتھ اُس کے گھر کو روانہ ہو گیا۔

میں نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ یہ آدمی کون تھا۔ قصبے میں ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ یہ آدمی اس ہسپتال میں ڈسپنسر تھا، اس لیے اس نے گھر میں اپنا دوائی خانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ معمولی امراض اور زخموں وغیرہ کا علاج کیا کرتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا تحصیل کے دفتر میں کلرک تھا۔ یہ قصبہ

تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ بیٹا جس کی عمر پچیس سال تھی میٹرک پاس تھا۔ اس آدمی کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔ دونوں اَن پڑھ تھیں۔ اُس دور میں مسلمانوں کے ہاں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا۔ پردہ بڑا ہی سخت تھا۔

اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دیواروں اور کواڑوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے ڈیوڑھی آئی جس کا ایک دروازہ باہر اور ایک اندر تھا۔ آگے صحن آگیا۔ دائیں طرف برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا کمرہ۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گیا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ بڑے اور چھوٹے کمرے کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ اور کوئی ایسا دروازہ یا کھڑکی نہیں تھی جو اس کمرے کا رشتہ کسی اور کمرے یا برآمدے سے قائم کرتی۔ یہ کمرہ دراصل کوٹھڑی تھی جو تین اطراف سے بند تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا جو اسے بڑے کمرے سے ملاتا تھا۔ ٹرنک اس چھوٹے کمرے یعنی کوٹھڑی میں رکھے ہُوئے تھے۔

مکان کے اور بھی کمرے تھے لیکن ان کا میری تفتیش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

صحن میں سیڑھیاں تھیں جو چھت پر جاتی تھیں۔ میں اُوپر گیا۔ اس مکان کی چھت دائیں بائیں اور عقب کے مکانوں سے ملی ہوئی تھی۔ فصیل بھی تھی اور بیت الخلاء چھت پر تھا۔ اُوپر سے چور آسکتا تھا، لیکن اُن دنوں چور کمرے میں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اکتوبر نومبر کا مہینہ تھا۔ گھر والے صحن اور برآمدے میں سوتے تھے۔ اس کے علاوہ چور کے لیے یہ مشکل بھی تھی کہ

سیڑھیاں بند اور نیچے دروازہ تھا جو (مجھے بتایا گیا کہ) بند رہتا تھا۔ کوئی اُوپر جائے تو کھولا جاتا تھا۔

میرے جائزے نے مجھے یقین دلا دیا کہ چور باہر سے نہیں آیا۔ باہر سے کوئی تجربہ کار چور آسکتا تھا اور اگر وہ تجربہ کار ہوتا تو سارے زیورات لے جاتا۔ وہ ٹرنک کے اُوپر کے سوٹ کیس وغیرہ نیچے ہی پڑے رہنے دیتا۔ یہ بھی قابلِ غور تھا کہ ایسی واردات جس میں چور اُسی جگہ ہاتھ ڈالتا ہے جہاں مال ہوتا ہے، ایک گھر بھیدی کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ گھر بھیدی عموماً گھر کے نوکر ہوتے ہیں۔ اس گھر میں نوکر بھی نہیں تھا نوکرانی بھی نہیں تھی۔

عورت جنّ یا بدروح تھی

میں جب مکان کا جائزہ لے کر بیٹھا تو ڈسپنسر کے دونوں بیٹے موجود تھے۔ میں نے اُن کے چہروں کو بڑی غور سے دیکھا۔ میں اِن چہروں پر آوارہ اور ناخلف بیٹوں کے تاثرات ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے نظر نہ آئے۔ میں نے ایک بات بڑے بیٹے سے کی لیکن جواب باپ نے دیا۔ میں نے دانستہ بڑے بیٹے سے ایک اور سوال پوچھا۔ اس کا بھی جواب باپ نے دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ جواب اسی کو دینے دیں۔

"باپ کی موجودگی میں بیٹے کا بولنا مناسب نہیں تھا" — اُس نے حاکموں کے لہجے میں کہا اور اس لہجے میں حقارت کا رنگ پیدا کر کے دونوں بیٹوں

سے کہا — "جاؤ دونوں۔ بھاگو یہاں سے۔"

وہ دونوں جانے لگے تو میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ چھوٹا بیٹا تو مایوس نظر آتا تھا۔ بڑے بیٹے کے چہرے پر غصّے کے نمایاں آثار پیدا ہو گئے تھے۔ میں جان گیا کہ یہ فرعون قسم کا باپ ہے۔ اپنی رائے کی تصدیق کے لیے میں نے اسے کہا کہ وہ جوان بیٹوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا کرے۔

"اگر اولاد کو اپنے پاؤں کے نیچے نہ رکھو تو خراب ہو جاتی ہے۔" اُس نے کہا — "میں نے بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے سامنے کبھی نہیں بولنے دیا۔"

"آپ انہیں مارتے پیٹتے بھی ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" — اُس نے جواب دیا — "میں تو اب بھی بڑے بیٹے کی ٹھکائی کر دیا کرتا ہوں۔"

اس موضوع کو میں نے یہیں رہنے دیا، البتہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا جسے میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ یہ شک بھی ہو سکتا تھا اور میرے شک کی شہادت بھی۔

"پیشتر اس کے کہ میں اس عورت کو تفتیش میں شامل کروں جس کے نام کی پرچی پر لوٹا گھوما تھا، میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس عورت نے چوری نہیں کی۔" — میں نے کہا — "آپ مجھے اسی طرح قائل کرائیں کہ چوری اسی نے کی ہے کہ وہ کس طرح اس گھر میں آئی ہو گی، ٹرنکوں والے کمرے تک کس طرح گئی ہو گی، اسے اتنا زیادہ وقت کس طرح ملا ہو گا کہ اُس نے زیور والا

ٹرنک کے اُوپر سے ایک سُوٹ کیس اُتارا، اس کے نیچے سے دوسرا سُوٹ کیس اُتارا، اس کے نیچے سے یہ وزنی ٹرنک اُتارا جو میں نے دیکھا ہے اور اس کے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا، صرف ہار اور نقدی نکالی، ٹرنک بند کیا اور پھر اتنا وزنی ٹرنک اور سوٹ کیس اس کے اُوپر رکھے اور وہ گھر سے نکل گئی، کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔"

"یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ اس نے چوری کس طرح کی ہے۔" — اُس نے کہا — "میں آپ کو سولہ آنے یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں، کہ چوری اسی نے کی ہے۔ میں جھوٹ بول سکتا ہوں، آپ جھوٹ بول سکتے ہیں، مولوی صاحب کا لوٹا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انہوں نے قرآن کا کلام پڑھ کر لوٹا گھمایا تھا۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کلامِ پاک کو تو برحق مانتے ہیں۔"

"میں قرآن کو برحق مانتا ہوں۔" — میں نے کہا — "اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ عورت انسان کی بچی نہیں۔ یہ چڑیل ہے یا جِن ہے یا بدرُوح ہے۔ آپ مولوی صاحب سے پوچھ لیں۔ اگر وہ عامل ہیں تو انہیں اس عورت کی اصلیت کا بھی علم ہو گا۔ کوئی انسان اس طرح چوری نہیں کر سکتا۔"

حیرت اور شاید دہشت سے بھی، اُس کا منہ کُھل گیا اور وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔

"جب تک مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملے گا میں اس عورت کو گرفتار کرنا تو دُور کی بات ہے اُسے تفتیش میں شامل ہی نہیں کروں گا۔" — میں نے کہا — "آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے یا آپ کے

گھر والوں نے جن افراد پر شک کیا تھا ان میں یہ عورت شامل تھی؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟" — میں نے پوچھا — وہ خاموش رہا۔ میں نے کہا — "اس لیے کہ آپ کے پاس اُس کے خلاف شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اُسے اس گھر میں اتنی بے تکلفی اور اتنی آزادی حاصل نہیں تھی کہ کھلے بندوں اس گھر میں پھرتی رہتی اور نظر بچا کر آپ کے زیورات اُٹھا کر لے جاتی۔"

"مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اس عورت کو بھی بلاؤ" — اُس نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اب اُس کی آواز میں پہلے والی خود اعتمادی نہیں تھی کہنے لگا — "مولوی صاحب کو غیب سے اشارہ ملا تھا۔"

غیب کے اشارے

میرے دل میں ایک اور شک پیدا ہوا۔ مولوی نے اس عورت پر کیوں شک کیا تھا؟ یہ عورت آئی تو مولوی کا لوٹا اسی کے نام پر گھوما میں غیب کے اشاروں کا قائل نہیں تھا۔ اگر اس مولوی کو واقعی غیب سے اشارے ملتے تھے تو وہ میرے کام کا آدمی تھا۔ مجھے مجرموں کا سراغ لگاتے جس اذیت سے گزرنا پڑتا تھا اس کا اندازہ آپ نے میری کہانیوں سے کیا ہوگا۔ یہ مولوی غیب کے اشاروں سے مجھے تفتیش کے جھنجھٹ سے بچا سکتا تھا میں نے ڈسپنسر سے کہا کہ وہ اپنے کسی بیٹے کو بھیجے اور مولوی کو یہاں بلا لائے۔

وہ ایک لڑکے کو بھیج کر میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے گھر کی مستورات سے بھی کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

"وہ تو پردے میں ہیں" — اُس نے کہا — "آپ مجھ سے پوچھ لیں۔"

"آپ دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں" — میں نے کہا — "یہ آپ کی بیوی اور بیٹیاں بتا سکتی ہیں کہ یہ عورت کس انداز سے اس گھر میں آتی تھی۔ مجھے اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"آپ مسلمان ہیں" — اُس نے کہا — "جوان لڑکیوں کا تھانیدار کے سامنے آنا ٹھیک تو نہیں۔"

"میں مسلمان بھی ہوں تھانیدار بھی ہوں، بردہ فروش نہیں ہوں" — میں نے کہا — "اگر آپ مجھے اپنے بیٹوں کے ساتھ بھی بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے، بیٹیوں کو بھی سامنے نہیں لاتے تو اپنی رپورٹ واپس لے لیں، میں اپنی تفتیش روک دیتا ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو اُس وقت کمرے سے بھگا دیا جب میں اُن سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کام میں کسی کی ایسی مداخلت کبھی برداشت نہیں کی تھی۔ مشتبہ عورت کے متعلق مجھے گھر کی عورتوں سے ہی کچھ پتہ چل سکتا ہے۔"

وہ اپنی بیٹیوں کو مجھ سے چھپا نہیں رہا تھا، پردے کی پابندی کر رہا تھا۔ وہ اُن مسلمانوں میں سے تھا جن میں مذہب کی اندھی عقیدت ہوتی ہے۔ اپنی عقل سے ذرہ بھر کام نہیں لیتے اور مذہب کے پردے میں مذہب کے منافی حرکات بھی کر گزرتے ہیں۔ ان کی نیت میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ میں اُسے

سمجھا تا رہا کہ وہ اپنا ہار اور نقدی واپس لینا چاہتا ہے تو اُسے میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا مگر وہ پستقد طبیعت کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

مولوی صاحب آ گئے۔ میں نے ڈسپنسر کو کمرے سے نکال دیا اور مولوی کو سامنے بٹھا کر غور سے دیکھا۔ میں نے اس مولوی سے زیادہ تندرست آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرہ جوانی کے جوش سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں صحت کا خمار تھا۔ جسم بھرا بھرا اور داڑھی چھوٹی چھوٹی تھی۔

"مولانا" — میں نے احترام سے کہا — "میں مسلمان ہوں۔ دل و جان سے آپ کی قدر کرتا ہوں، لیکن میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ کبھی مجھے ناخوشگوار باتیں بھی کرنی پڑتی ہیں۔ میں آپ سے پیشگی معافی مانگ لیتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ میں جو پوچھوں وہ سوچ کر اور بالکل سچ بتائیں، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ قانون کا معاملہ ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر کے مخمور لہجے میں کہا — "پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ تم دنیا کے قانون کی بات کرتے ہو، ہم خدا کے قانون کے غلام ہیں۔"

"سُنا ہے آپ کے لوٹے نے ایک چور پکڑا ہے۔"

"ہاں!" — اُس نے خمار کے لہجے میں کہا — "وہ ایک عورت ہے۔"

"کیا یہ عورت انسان ہے؟"

"تو کیا تم اُسے گدھی سمجھتے ہو؟" — اُس نے جواب دیا۔

"نہیں حضور!" — میں نے غلاموں کے لہجے میں کہا — "گدھی تو نہیں سمجھتا، یہ عورت مجھے جن یا بدروح معلوم ہوتی ہے یا اس پر جن یا بدروح کا قبضہ ہے۔ آپ خدا کے برگزیدہ انسان ہیں۔ غیب سے آپ کو اشارے ملتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عورت عورت ہی ہے یا کوئی شرشرار ہے۔"

"تمہیں یہ شک کیوں ہوا ہے؟"

"اس لیے حضورِ انور!" — میں نے جواب دیا — "کہ یہ تو عورت ذات ہے کوئی پیشہ ور اور استاد چور بھی اس طرح چوری نہیں کر سکتا جس طرح اس عورت نے کی ہے۔ وہ اس طرح آئی کہ کسی کو نظر نہیں آئی۔ اس نے زیورات والے ٹرنک کے اُوپر سے نہ ٹرنک اتارا نہ سوٹ کیس اتارے نہ ٹرنک کا تالا کھولا اور سونے کا ہار لے گئی۔ اسے شاید صرف ہار پسند تھا۔ یہ کسی عورت کی بدروح معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سُنا ہے کبھی کبھار کوئی چڑیل یا بدروح یا جن کسی آدمی پر عاشق ہو جاتا ہے اور عورت کے رُوپ میں آ کر اُس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ یہ عورت ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔"

"تم اسے بلا کر گرفتاری کی دھمکی دو" — اُس نے پہلے کی طرح خمار آلود آواز میں کہا — "پھر میں اسے اپنے گھر بلا کر دیکھوں گا کہ اصل میں کیا ہے۔"

"مولانا عالی مقام!" — میں نے جاہل مریدوں کی طرح پوچھا — "اس

گھر والوں کو اس عورت پر شک نہیں تھا۔ آپ اپنا لوٹا لے کر آئے اور کہا کہ اس عورت کو بھی بلاؤ۔ اگر حضور کے مزاجِ مقدس پر گراں نہ گزرے تو اس ناچیز بندے کو بتا سکتے ہیں کہ جناب کو اس عورت پر کیوں شک ہُوا تھا؟"

"اگر یہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ ہمیں اس گناہگار پر کس طرح اور کیوں شک ہُوا تھا تو ہم میں اور تم جیسے عام بندوں میں فرق کیا رہ جائے؟ غیب کے اشارے ہر کسی کو نہیں ملا کرتے"۔۔۔ وہ اب اس طرح بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

"حضورِ والا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے اس عورت کو بھی غیب سے اشارہ ملا تھا کہ فلاں طریقے سے چوری کرو۔"

"یہ گناہگار عورت ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "گناہگاروں کو اشارے نہیں ملا کرتے۔"

"پھر عالی جاہ!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اس عورت نے چوری بھی نہیں کی۔"

"میرا لوٹا جھوٹ نہیں بول سکتا"۔۔۔ اُس نے آواز میں رُعب پیدا کر کے کہا۔۔۔ "خدا کے کاموں میں دخل نہ دو۔"

"قابلِ صد احترام مولانا!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آپ کا لوٹا جھوٹ نہیں بول سکتا، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

اُس نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے اُسے نیچے سے سُوئی چبھو دی ہو۔ اُس کے گندمی گالوں پر سُرخی آ گئی۔

میں نے آگے جھک کر اُسے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔ "ہوش میں آؤ مولوی صاحب! میں مسلمان ہوں۔ آپ کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ مجھے گستاخی کا موقع نہ دیں۔"

"میں لوٹے کے عمل کی بات کر رہا ہوں۔"

"جہاں ہتھکڑیوں کی مسمریزم چلتی ہے وہاں لوٹے کا جادو نہیں چل سکتا"۔۔۔ میں نے تھانیداروں کی طرح کہا۔۔۔ "مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ آپ کو کس طرح معلوم ہُوا تھا کہ یہ عورت بھی مشتبہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوٹے کے عمل کے لیے اُنہیں بلایا جاتا ہے جن پر شک ہوتا ہے۔ شک کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ آپ سارے محلے کو تو لوٹے کے گرد جمع نہیں کر سکتے۔ اس عورت پر آپ نے شک کیا تھا۔ شک کی کیا وجہ تھی؟"

"مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "اُس میں مجھے کچھ راز معلوم ہو جاتے ہیں۔"

"میرے پاس چوری چکاری کے چار پانچ کیس ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "مُلزموں کا پتہ نہیں چل رہا۔ آپ جیسی بھی خدمت کہیں گے کروں گا۔ ملزموں کی نشاندہی کر دیں۔ آپ کو غیب کے اشارے ملتے ہیں اور آپ پر کیفیت بھی طاری ہوتی ہے جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔"

خمار اُتر گیا

وہ اب خمار والی کیفیت سے بیدار ہو چکا تھا۔ اُس کے چہرے

کا رنگ بدل گیا تھا۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ لوٹے کو ایک لڑکا دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھتا ہے۔ بعض عامل لوٹے کو خود تھام کر رکھتے ہیں۔ اس مولوی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اُس نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک لڑکے کو لوٹے پر ہاتھ رکھنے اور پرچی ڈالنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے ڈسپنسر کو اندر بلا کر کہا کہ وہ اس لڑکے کو بلا لائے۔ مولوی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"لوٹا جب گھوما تھا تو آپ نے اس عورت سے کچھ کہا تھا؟" — میں نے مولوی سے پوچھا — "مجھے تفصیل سے بتائیں کہ اس کے ساتھ آپ نے یا ڈسپنسر نے کیا سلوک کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوٹے کے عمل کو نہیں مانتے" — مولوی نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب بناوٹ نہیں تھی۔ کہنے لگا — "میں نے اپنی طرف سے تو اس پر چوری کا الزام نہیں لگایا۔ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں، کوئی دشمنی نہیں۔"

اس قسم کی باتیں کر کے وہ مجھے اپنے خلاف شک میں ڈال رہا تھا۔ میں پوچھ کچھ اور رہا تھا۔

"میں نے جو بات پوچھی ہے وہ بتائیں" — میں نے اُسے کہا۔

"میں نے سب کو کہہ دیا کہ چوری اسی عورت نے کی ہے" — اُس نے کہا — "ڈسپنسر نے اُسے سب کے سامنے کہا کہ وہ مال دے دے۔ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ وہ غصّے میں آ گئی۔ قسمیں کھانے لگی۔"

"مولوی صاحب!" — میں نے کہا — "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ زبان

سے بات نکالنے سے پہلے کئی بار سوچ لیں۔ آپ کے الفاظ آپ کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ آپ نے اس عورت کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے گواہ ابھی موجود ہیں۔"

میں نے اُسے یہ بات کچھ سوچ کر کہی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایک خاص قسم کا ردِعمل صاف نظر آیا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ مولوی اور ڈسپنسر نے اس عورت کے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے اور اس کا کوئی گواہ بھی ہے یا نہیں۔ مولوی کے چہرے کے تاثر کی تبدیلی نے میرا شک پختہ کر دیا۔

"مولوی صاحب!" — میں نے اُس کی پوری بات سُنے بغیر کہا — "آپ ان لوگوں کے امام ہیں۔ میں بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں کسی وقت آپ کو تھانے بلاؤں گا اور آپ کا بیان لوں گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس عورت نے چوری نہیں کی؟" — اُس نے پوچھا — "آپ اسے تھانے نہیں بلائیں گے؟"

"میں ابھی بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کروں گا" — میں نے کہا — "اگر آپ لوگ خود ہی کوئی تصفیہ کر لیں تو بہتر ہوگا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کسی مسلمان کی بے عزتی نہ ہو۔"

میرا مقصد دراصل کچھ اور تھا۔ اتنے میں وہ لڑکا آ گیا جسے لوٹے کے عمل میں استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے مولوی سے پوچھا کہ یہی لڑکا تھا؟ وہ معلوم

نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر زبان ہکلا گئی۔

میں اس واردات پر غور کرنے کے لیے تھانے جانے کے لیے اُٹھا۔ لڑکے سے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے چلے۔ لڑکے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بار بار مولوی کی طرف دیکھتا تھا۔

میں باہر نکلا تو لڑکے کا باپ میرے کانسٹیبل کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے جُھک کر سلام کیا اور بولا "حضور! یہ میرا بچّہ ہے۔ اسے حضور نے کیوں بلایا ہے؟"

لڑکے کو دیکھا۔ خوف نے اُس کا چہرہ سفید کر دیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس کے باپ سے کہا کہ وہ بھی اپنے بچے کے ساتھ تھانے چلا چلے۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

قصّہ لڑکے اور لوٹے کا

پولیس اور تھانے کی دہشت سے جو لوگ واقف ہیں اس کے اثرات کو وہی بیان کر سکتے ہیں۔ میں نے مولوی کو وقتی طور پر فارغ کر دیا۔ ڈسپنسر کو بھی ساتھ نہ لیا۔ لڑکے اور اس کے باپ کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔ باپ کی حالت بہت بُری ہو گئی تھی۔ میری تسلیوں اور حوصلہ افزائی کا اُس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے مخبروں کو بلانے کا انتظام کیا، پھر لڑکے اور اس کے باپ کو اپنے دفتر میں بُلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"بیٹا!" — میں نے لڑکے سے کہا — "میں جو پوچھوں بالکل صحیح بتانا ورنہ اس تھانے سے نکل کر نہیں جا سکو گے۔"

"بالکل صحیح بتانا اوئے!" — باپ نے بیٹے سے کہا — "خان صاحب کے آگے جھوٹ نہ بولنا۔"

"لوٹا اپنے آپ گھوما تھا؟" — میں نے لڑکے سے پوچھا۔

لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ باپ کی حوصلہ افزائی سے اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا — "نہیں جی۔ لوٹا اپنے آپ نہیں گھوما تھا.... میں نے گھمایا تھا۔"

"کیوں؟"

"مولوی صاحب نے کہا تھا" — لڑکے نے جواب دیا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اُسے تسلّی دلاسہ دیا۔ پانی منگوا کر اُسے پلایا۔

"ڈرو نہیں" — میں نے کہا — "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

بڑی مشکل سے اُس سے پوری بات سُنی۔ کچھ جرح کی اور یہ ڈرامہ سامنے آیا کہ یہ لڑکا مولوی سے مسجد میں قرآن پڑھنے جاتا تھا۔ ایک روز مولوی نے اسے کہا کہ وہ ایک گھر میں لوٹے کے عمل کے لیے جا رہا ہے۔ اس میں وہ اس لڑکے کو استعمال کرے گا۔ لڑکے کی ڈیوٹی یہ بتائی کہ وہ لوٹے کو دائیں بائیں سے دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھے گا۔ مولوی اُسے ایک ایک پرچی دے گا جو وہ لوٹے میں ڈالے گا۔ پھر لڑکا لوٹا اُلٹا کر کے پرچی باہر پھینک دے گا۔

مولوی اُسے اگلی پرچی دے گا اور لڑکا وہی عمل دہرائے گا۔ مولوی نے اسے بتایا کہ ہر پرچی لوٹے میں ڈالنے کے لیے مولوی کے ہاتھ سے لیتے وقت وہ مولوی کی طرف دیکھے گا۔ کوئی ایک پرچی لڑکے کو دے کر مولوی اپنی آنکھیں بند کر کے کھولے گا۔ یہ پرچی لوٹے میں ڈال کر لڑکا لوٹے کو اتنا گھما دے گا کہ ہر کسی کو لوٹے کی حرکت نظر آجائے۔

مولوی نے لڑکے کو اس کام کے چار آنے دیئے۔ لوٹا گھمانے کی ریہرسل کرائی اور ایک روز اُسے ڈسپنسر کے گھر لے گیا۔ وہاں پانچ چھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مولوی نے جاتے ہی کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور اوٹ پٹانگ سی حرکتیں کر کے کہا کہ ایک انسان کم ہے۔ اُس نے عجیب طریقے سے ایک گھر کی سمت اور نشانیاں بتا کر کہا کہ اس عورت کو بلایا جائے۔

وہ عورت آگئی۔ مولوی نے لوٹا فرش پر رکھ کر لڑکے کو بتایا کہ لوٹے کو کس طرح پکڑنے۔ لڑکے نے لوٹے کے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ لیے۔ مولوی نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر ہر ایک عورت سے نام پوچھ کر پرچیوں پر لکھ لیے۔ پھر ایک ایک پرچی لڑکے کے ہاتھ میں دینے اور اُسے لوٹے میں ڈالنے کے لیے کہنے لگا۔

لڑکا ہر پرچی لیتے وقت مولوی کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تھا۔ آخر ایک پرچی لڑکے کے ہاتھ میں دے کر مولوی نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ لڑکے نے پرچی لوٹے میں ڈالی اور دونوں ہاتھ لوٹے کے پہلوؤں پر رکھ کر لوٹے کو گھما دیا۔ سب نے لوٹے کی یہ حرکت دیکھی۔ مولوی نے لوٹے سے پرچی نکال کر نام

پڑھا۔ یہ اُس عورت کا نام تھا جسے مولوی نے بُلایا تھا۔ یہ عورت شور مچانے لگی کہ میں نے کسی کی چوری نہیں کی۔ یہ جھوٹا الزام ہے۔

مولوی نے اُسے کہا کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس نے اُس کا جُرم ثابت کیا ہے۔ ڈسپنسر نے اُسے کہا کہ وہ ہار اور روپے واپس کر دے۔ عورت رونے لگی۔ مولوی نے اسے کہا کہ نہا دھو کر مسجد میں آجانا اور وہاں بتانا کہ تم نے چوری نہیں کی۔ عورت نے کہا کہ میں نہیں آؤں گی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی کہ میں دیکھتی ہوں کہ کون مجھے چور کہتا ہے۔

لڑکے کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اُسے اور اُس کے باپ سے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں اور کسی سے ذکر نہ کریں کہ انہوں نے مجھے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ لڑکے سے کہا کہ مولوی اس سے ضرور پوچھے گا۔ اُسے یہ بتانا کہ تم نے مجھے اصل بات نہیں بتائی۔ باپ کو کچھ اور ہدایات دے کر دونوں کو گھر بھیج دیا۔

مجھے یہی شک تھا جس کی تصدیق اس لڑکے نے کر دی۔ مولوی بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی سقانیدار کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتا۔ میں نے ایسے کئی مولوی، عامل، پیر، جوگی، پنڈت، سنیاسی اور سادھو دیکھے تھے۔ پولیس والے ان کی اصلیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس مولوی نے پہلا تھانیدار دیکھا تھا۔ یہاں میں اتنی سی بات کہوں گا کہ عوام الناس کو اس مقصد کے لیے گنوار اور اَن پڑھ رکھا جاتا ہے کہ اُنہیں اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کیا جائے۔ مذہبی راہنما بھی یہی کرتے ہیں اور سیاسی راہنما بھی یہی کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ مولوی میرے لیے کوئی عجیب و غریب چیز نہیں تھی۔

مجھے اب یہ دیکھنا تھا کہ مولوی کی نیت کیا تھی۔ کیا وہ اس عورت کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا؟ کیا ڈسپنسر بھی بلیک میلنگ میں شامل ہے؟ اور کیا ہار اور نقدی چوری ہوئی بھی ہے یا نہیں؟ یہ واضح ہو کر میرے سامنے آنے لگا کہ چوری نہیں ہوئی۔ اگر چوری ہوئی ہوتی تو تمام زیورات جاتے۔ قرائین بتا رہے تھے کہ مولوی اور ڈسپنسر نے اس عورت کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس جرم کے پس منظر وغیرہ کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ طریقہ صحیح نہیں تھا کہ میں ان دونوں سے پوچھ گچھ کرتا بلکہ انہیں یہ تاثر دینا تھا کہ مجھے اُن پر کوئی ایسا ویسا شک نہیں اور میری توجہ صرف چوری پر ہے۔

مجھے عقل مند قسم کے مخبروں کی ضرورت تھی۔ میں نے مخبر بلا رکھے تھے۔

حُسن اور غربت

شام کو سول ہسپتال کا ڈاکٹر آگیا۔ ڈسپنسر اسی ہسپتال میں ملازم تھا۔ اُس نے ڈسپنسر کے کیس کی سفارش کی اور کہا کہ ڈسپنسر نے شکایت کی ہے کہ میں چوری کا مال برآمد کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا۔ ڈاکٹر میرے ساتھ باتیں کر ہی رہا تھا کہ تحصیلدار آگیا۔ ڈسپنسر کا بیٹا تحصیل کے دفتر میں ملازم تھا۔ اُس نے تحصیلدار سے کہا تھا کہ میں تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ وہ بھی سفارش

لے کر آیا تھا۔ دونوں کے میرے ساتھ تعلقات اچھے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ آج کی تفتیش میں میرے سامنے کیا آیا ہے مولوی اور اُس کے لوٹے کے متعلق انہیں بتلاتے مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ دونوں ہندو تھے۔ ہندو خود توہم پرستی کی ماری ہوئی قوم ہے لیکن مسلمانوں کی کمزوریوں اور مضحکہ خیز توہمات کا ہندو مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس ہندو ڈاکٹر اور تحصیلدار نے بھی مولوی کا مذاق اُڑایا جو دراصل اسلام پر طنز تھی۔ بہرحال وہ میرے ہمنوا ہو گئے۔

"یہ ڈسپنسر عادات اور اخلاق کا کیسا ہے"؟ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"کٹر مسلمان ہے" — ڈاکٹر نے بتایا — "بدمزاج اور خبطی ہے۔ اگر مجھے اُس کی دو جوان بیٹیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے نوکری سے نکلوا دیتا"۔

میں نے ڈسپنسر کے بیٹے کے متعلق تحصیلدار سے پوچھا۔ تحصیلدار کوئی رائے نہ دے سکا کیونکہ یہ آدمی اُس کے دفتر میں معمولی سا کلرک تھا۔ تحصیلدار اُسے اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر گپ شپ لگا کر یہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد میرے بلائے ہوئے مخبر آنے لگے۔ اِن میں ایک عورت بھی تھی۔

پہلے سُنائی ہوئی کہانیوں میں آپ کو میں نے مخبر عورتوں کے متعلق تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ کون ہوتی ہیں، کہاں سے آتی ہیں اور کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ اتفاق سے میری یہ مخبر عورت ڈسپنسر کے محلے کی رہنے والی تھی اور مسلمان تھی۔ میں نے اِن مخبروں کو اس واردات میں ملوث افراد کے کردار وغیرہ کے متعلق

زیادہ سے زیادہ معلومات لانے کو کہا۔ مخبر چلے گئے تو میں نے مخبر عورت سے کہا کہ وہ اُس عورت کے متعلق معلوم کرے جس کے نام پر مولوی نے لوٹا گھمایا تھا۔ اس کے علاوہ ڈسپنسر کی دونوں بیٹیوں کے کردار اور عادات سے مجھے واقفیت حاصل کرنی تھی۔ یہ لڑکیاں بڑے سخت پردے میں تھیں لیکن میں نے پردے پردے میں کچھ ڈرامے دیکھے تھے۔ یہاں بھی مجھے ایسا ہی شک تھا۔ مشتبہ عورت کے متعلق تو مخبر عورت نے اُسی وقت بتا دیا کہ شریف عورت ہے۔ البتہ اُس کی دو کمزوریاں ہیں۔ ایک یہ کہ غریب ہے اور دوسری یہ کہ غریب ہے۔

میں نہانے، اور کچھ کھانے پینے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

رات کے غالباً دس بج رہے تھے کہ ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا کہ ایک آدمی آیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ بتا نہیں رہا تھا کہ کام کیا ہے۔ میں نے اُسے اپنے کوارٹر میں ہی بلا لیا۔ وہ غریب سا آدمی تھا اور بیمار تھا۔ میرے سامنے آکر فرشی سلام کرنے لگا۔ میں نے اُسے بٹھایا۔

اُس نے بتایا کہ وہ اُس عورت کا خاوند ہے جس کے نام پر لوٹا گھمایا تھا۔ بات شروع کرتے ہی وہ رو پڑا۔ میں نے اُس کے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا، حوصلہ افزائی کی اور ہمدردی سے اُس کی بات سُنی جو مختصراً یوں تھی کہ چند دن ہوئے ڈسپنسر اُس کے گھر گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کا ہار اور تین سو روپے چوری ہو گیا ہے اور مولوی صاحب نے لوٹا گھمایا ہے۔ لوٹا اس آدمی کی بیوی

کے نام پر گھوما ہے۔ ڈسپنسر نے اُسے کہا کہ وہ مال واپس کر دے۔ یہ آدمی بہت گھبرایا۔ اُسے اپنی بیوی سے اس قسم کے جرم کی توقع نہیں تھی۔ بیوی نے اُسے بتایا ہی نہیں تھا کہ اُس پر شک کیا گیا ہے۔ ڈسپنسر کو رخصت کر کے اُس نے بیوی سے پوچھا۔ بیوی نے بتا دیا اور قسمیں کھائیں کہ اُس نے چوری نہیں کی۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی ڈسپنسر کے گھر کبھی کبھار جاتی ہے لیکن تعلقات گہرے نہیں۔ محض دنیاداری کا میل جول ہے۔ اُسی شام مولوی نے اس آدمی کو اپنے ہاں بلا کر وہی بات کہی جو ڈسپنسر نے کہی تھی۔ مولوی نے یہ بھی کہا — "اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج دو، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

مولوی کا چونکہ تقدّس اس آدمی پر بھی طاری تھا، اس لیے وہ مان گیا کہ اُس کی بیوی نے چوری کی ہے۔ اس شخص کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہار اور نقدی رکھے کہاں تھے اور کیا یہ چوری ممکن بھی تھی یا نہیں۔ اس کی عقل اور اعصاب پر ڈسپنسر کی دھمکیاں، مولوی کا تقدس اور اُس کا لوٹا سوار ہو گیا تھا۔

اُس نے گھر جا کر بیوی کو پیٹا اور اُسے کہا کہ وہ مولوی کے پاس جائے۔ بیوی نے انکار کر دیا۔ اس سے خاوند کے دل میں شک پختہ ہو گیا کہ اُس کی بیوی چور ہے۔ اُس نے بیوی پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ مولوی کے پاس جائے۔ تب بیوی نے اُسے بتایا کہ وہ کس نیت سے اُسے بلا رہا ہے۔ کوئی ایک ماہ پہلے کا ذکر ہے (اسے بیوی نے بتایا کہ) بیوی ایک جمعرات مولوی کو روٹی دینے گئی۔ اس سے پہلے بھی یہ عورت مسجد میں روٹی بھیجا کرتی تھی۔

کسی کے ہاتھ بھیج دیتی تھی۔ خاوند بھی لے جاتا تھا لیکن اُس روز خاوند گھر نہیں تھا۔ کوئی دوسرا بھی نہ ملا۔ وہ خود چلی گئی۔ مولوی نے اُسے اپنے حجرے میں بٹھا کر "ازراہِ کرم" دم درود کیا۔ عورت متاثر ہوئی۔ مولوی نے پھر بلایا۔ وہ دو تین بار گئی۔

ایک روز مولوی نے ایسی حرکتیں کیں جس نے عورت کے دل میں مولوی کے تقدس اور احترام کو مجروح کر دیا۔ یہ اُن عورتوں میں سے تھی جو اپنے خاوندوں کو خدا سمجھتی اور عصمت پر جان قربان کر دیتی ہیں۔ اُس نے مولوی کے پاس جانا چھوڑ دیا مگر مولوی نے اُس کے گھر آنا شروع کر دیا۔ مولوی کو گھر میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ شخص عام قسم کا مُلّا نہیں، عامل اور غیب کے اشارے پانے والا برگزیدہ مولانا تھا۔ بیوی اُس کے جال میں نہ آئی۔ اُس نے اپنے خاوند کو صرف اس لیے نہ بتایا کہ وہ پریشان ہوگا۔ ایک روز اس عورت نے تقدس اور احترام کو الگ پھینک دیا اور مولوی کی بے عزتی کر دی۔

اس سے دو تین روز بعد مولوی خاوند کی غیر حاضری میں عورت کے گھر گیا اور اُسے کہا کہ آج آخری روز ہے۔ کل جو کچھ ہوگا اس کا گلہ مجھ سے نہ کرنا۔ عورت یہ اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اُس نے مولوی کو ایک بار پھر دھتکار دیا۔ دوسرے دن اُسے ڈسپنسر کے گھر بلایا گیا۔ وہ چلی گئی۔ آگے مولوی اور سات آٹھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں لوٹا رکھا تھا جو کہ ایک لڑکے نے پکڑ رکھا تھا۔

قانون غریبوں کے لیے

اس سے آگے جو کچھ ہُوا وہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ عورت کے خاوند کو اتنا صدمہ ہُوا کہ اس کی صحت پہلے ہی ٹھکرائی ہوئی تھی، اُسے بخار آنے لگا۔ ڈسپنسر اُسے کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی سے کہو کہ چوری کا مال واپس کر دے۔ خاوند بیمار ہُوا تو سول ہسپتال گیا۔ ڈاکٹر نے جو نسخہ لکھا وہ اسی ڈسپنسر نے بنایا۔ ڈسپنسر اس پر کچھ مہربان ہوگیا۔ دوائی ہمدردی سے دی اور دوستانہ لہجے میں کہا کہ وہ ہار اور نقدی واپس کر دے۔ یہ آدمی اُس کی منت سماجت کرتا رہا۔ آخر یہ دن آیا کہ ڈسپنسر نے تھانے رپورٹ دی اور میں اُس کے گھر گیا۔ کسی کے گھر پولیس کا جانا بہت بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ اس آدمی کو بھی پتہ چل گیا کہ ڈسپنسر کے گھر پولیس اُتری ہوئی ہے۔

اُس نے مجھے بتایا کہ میرے وہاں سے آنے کے بعد ڈسپنسر اُس کے گھر گیا اور اُسے کہا — "میں نے تمہاری بیوی کا نام لکھوا دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے، مال دے دو، ورنہ کل تمہاری بیوی حوالات میں بند ہوگی۔"

مولوی نے بھی ایسی ہی دھمکی دی۔

"جنابِ عالی!" — اس آدمی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے سوا میرا کوئی نہیں۔ اگر آپ میری بیوی کو حوالات میں بند کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی بجائے مجھے گرفتار کر لیں۔ میں جانتا ہوں آپ مولوی صاحب کے

خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ قانون ہم جیسے غریبوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر آپ کے دل میں رحم آجائے تو میری بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ لیں"۔

مولوی کے خلاف مجھے شہادت مل چکی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مولوی کے ساتھ میری ملاقات ہوئی اور میں اُس کا مرید بن کر اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو اُس نے مجھے کہا تھا ــــ "تم اسے دھمکی دو، پھر میں اُس کے ساتھ بات کروں گا" ــــ وہ اِس عورت کو پھانسنے کے لیے اور اُس سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

مجھے چونکہ مولوی کے خلاف لڑکے سے شہادت مل چکی تھی اس لیے میں نے اس عورت کے خاوند کے بیان کو فوراً سچ مان لیا۔ اُس نے جس طرح رو رو کر مجھے یہ واقعہ سنایا کوئی پتھر دل ہوتا تو اُس کے بھی آنسو نکل آتے۔ اُس نے بعض باتیں جذباتی انداز سے کیں۔

میں کچھ دیر کے لیے بھول گیا کہ میں تھانیدار ہوں۔ مجھے ذرا محتاط ہونا چاہیئے تھا مگر میں بھی جذباتی ہو گیا اور اُسے بتا دیا کہ اُس کی بیوی کے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت نہیں۔ مولوی کے متعلق میں نے اسے بتایا کہ وہ مولوی ہرگز نہیں، یہ کوئی نوسر باز ہے جس نے مسجد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ میں مولوی کو گرفتار کر لوں گا۔ میرے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ مجھے شک ہے کہ ڈسپنسر کے گھر چوری ہوئی ہی نہیں۔

مجھے یہ خیال آگیا کہ اس آدمی کے بیان کی تصدیق کے لیے اس کی بیوی سے ملنا ضروری ہے۔ میں اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں اُس کے ساتھ اُس کے

گھر چلا گیا۔ اُس کی بیوی کو تھانے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے جب لالٹین کی روشنی میں اُسے اُس کے گھر میں دیکھا تو اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ اگر خاوند یہ تسلی نہ دے دیتا کہ میں اُسے گرفتار نہیں کروں گا تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ وہ واقعی خوبصورت عورت تھی اور جوان بھی تھی۔ اُس کا خاوند چھوٹی سی دکان کرتا تھا۔ گھر میں اگر غربت نہیں تو فارغ البالی بھی نہیں تھی۔

میں نے خاوند کو الگ کر کے اس عورت کی بات سُنی، اور اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے کچھ باتیں پوچھیں۔ ان سے اُس کے خاوند کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ اِس دوران اُس کے آنسو بہتے رہے۔

بہت اچھے کردار کی عورت تھی۔ ڈسپنسر اُسے مسلسل دھمکیاں دے رہا تھا اور مولوی اپنا جال پھینک رہا تھا۔ پسماندہ اور بے علم انسان کی عقیدت بڑی سخت ہوتی ہے۔ یہ عورت اپنا دامن تو بچا رہی تھی لیکن ڈرتی بھی تھی کہ مولوی مذہبی پیشوا ہے جس کی بے ادبی گناہ ہے۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ اُس پر پولیس اور گرفتاری کا خوف تھا۔ میں نے اُس کے دل سے دونوں خوف نکالنے کی ہمدردانہ کوشش کی۔ یہ میاں بیوی تنکوں کے سہارے تلاش کر رہے تھے۔ میرے جذباتی سہارے نے انہیں سنبھالا دیا۔

میں مولوی اور ڈسپنسر کو بخشنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے سامنے واردات کچھ اور تھی۔ یہ سونے کے ایک ہار اور نقدی کی چوری کی رپورٹ تھی۔ مجھے اس کی تفتیش کرنی تھی اور مجرموں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا تھا۔ مولوی جس طرح

اس عورت کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی میرے پاس کوئی باقاعدہ رپورٹ نہیں تھی۔ تاہم اس شخص کو میں قانون کے شکنجے میں لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس عورت اور اس کے خاوند کو کچھ باتیں بتائیں اور کہا کہ وہ ابھی زبانیں بند رکھیں۔ اور میں تھانے چلا گیا۔

اگر دو گھنٹے زندہ رہ سکا

میں اب اس لائن پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ کوئی چوری نہیں ہوئی اور یہ ڈھونگ اس عورت کو خراب کرنے کے لیے رچایا گیا ہے۔ میں یہ بھی سوچنے لگا کہ اگر چوری کی رپورٹ جھوٹی ہوئی تو میں کیا کروں گا۔

میں نے میاں بیوی کی مظلومیت، غربت اور بے بسی سے متاثر ہو کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھا اور انہیں اپنی حمایت کا یقین ضرورت سے زیادہ دلا آیا۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ دونوں مظلوم ہیں اور بلیک میلنگ کا شکار تو ہو رہے ہیں لیکن یہ دونوں ذہنی طور پر ان باتوں کو دل میں دبا کر رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے جو میں انہیں بتا آیا ہوں۔

اس کا نتیجہ دوسرے دن سامنے آگیا۔ دن کے دس گیارہ بجے ہوں گے کہ یہ عورت دوڑتی تھانے میں آئی۔ اس کے ساتھ اس کے پڑوس کا ایک آدمی تھا۔ عورت نے بتایا کہ اس کا خاوند بیمار ہے اور کئی دنوں سے سرکاری ہسپتال سے دوائی لے رہا ہے۔ دوائی یہی ڈسپنسر بناتا ہے۔

اس نے بتایا کہ آج صبح اس کا خاوند دوائی لے کر آیا تو اس نے بیوی کو بتایا کہ آج ڈسپنسر کے ساتھ شدید جھڑپ ہو گئی ہے۔ خاوند نے بتایا ——"میں دوائی لینے اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا تو ڈسپنسر نے کہا کہ اوئے، تم چوری کا مال سیدھے طریقے سے واپس کرو گے یا نہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں تھانے میں رپورٹ کر چکا ہوں۔ اگر آج مجھے مال نہ ملا تو گرفتار کرا دوں گا.... میں نے اسے کہا کہ تھانیدار مجھے نہیں تمہیں اور تمہارے مولوی کو گرفتار کرے گا۔ تھانیدار رات ہمارے گھر آیا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے اسے بتا دیا ہے کہ تم اور مولوی کیوں میری بیوی پر شک کرتے ہو۔"

مختصر یہ کہ اس آدمی نے ڈسپنسر کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو میں نے اسے کہی تھیں۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ خاوند نے اسے یہ بات سنا کر دوائی کی پہلی خوراک پی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ابکائیاں آنے لگیں اور اس کے بعد اسے قے آئی۔ پھر قے میں خون آنے لگا۔

اس کی بیوی کو شک ہوا کہ ڈسپنسر نے اسے دانستہ زہریلی دوائی دے دی ہے۔ وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی۔ مجھے بھی یہی شک ہوا کہ ڈسپنسر نے انتقامی کارروائی کی ہے۔ ہسپتال تھانے سے دور نہیں تھا۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو اس پیغام کے ساتھ ہسپتال کو دوڑایا کہ ڈاکٹر فوراً فلاں محلے میں آجائے۔ ہو سکتا ہے ایک آدمی کا نزعی بیان لینا پڑے۔ میں خود اس عورت کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔

اس محلے کا ایک آدمی تو عورت کے ساتھ تھا، میں نے وہاں سے

ایک اور آدمی کو گواہ کے طور پر ساتھ لے لیا۔ اس عورت کے خاوند کو دیکھا۔ وہ ایک بالٹی میں قے کر رہا تھا جس میں خون کی آمیزش تھی۔ دوائی کی شیشی پاس پڑی تھی جو میں نے قبضے میں لے لی۔ اس آدمی پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری تھی میں نے اُس سے چند باتیں پوچھیں۔ وہ اچھی طرح بول نہیں سکتا تھا۔ ایک بات اُس نے یہ کہی ــــ "اُس (ڈسپنسر) نے مجھے کہا تھا تم چلتے پھرتے کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔"

مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ شخص زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر آگیا۔ اُس نے مریض کا معائنہ کیا اور کہا کہ اسے فوراً ہسپتال لے چلو۔ اُس کی دوائی کی شیشی دیکھی۔ اسے ہلایا اور غور سے دیکھا۔ مجھے کہنے لگا کہ اس دوائی کا معائنہ ضروری ہے، ڈسپنسر کو آپ فوراً گرفتار کر لیں۔ مریض کو چارپائی پر ڈال کر چار آدمی ہسپتال لے گئے۔ میں نے ڈسپنسر کو اپنے ساتھ لے لیا اور اُسے کہا کہ وہ میری حراست میں ہے۔ ڈاکٹر مریض کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر باہر آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مریض اگر دو گھنٹے زندہ رہا تو موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ اُس نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ یہ دوائی اُسی نے مریض کو دی تھی؟ ڈسپنسر نے جواب دیا کہ اُسی نے دی تھی۔

"اس میں کیا ڈالا تھا؟" ــــ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ڈسپنسر خاموش رہا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ دوائی کہاں بھیجی جائے گی" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ

"اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہاں تمہارا جرم صاف نظر آجائے گا۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا" ــــ ڈسپنسر نے کہا۔

ڈاکٹر نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے ڈسپنسر کو اپنے اسے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ تھانے جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دو۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے اور ڈاکٹر نے شیشی کا اور مریض کی قے کے کچھ حصّے کو ایک شیشی میں بند کر کے ایک پیکٹ بنایا۔ ڈاکٹر نے چٹھی لکھی۔ ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ پیکٹ اور چٹھی اُسے دے کر کہا کہ ایگزامینر کے پاس جائے اور رپورٹ لے کر آئے۔ اسے بذریعہ ریل گاڑی اسّی میل دُور جانا تھا۔

ڈاکٹر نے اپنی رائے یہ دی کہ ڈسپنسر نے دوائی میں ایک دوائی زیادہ مقدار میں ڈال دی ہے۔ مجھے اس دوائی کا نام یاد نہیں رہا۔ اس کے ایک یا دو قطرے ڈالے جاتے تھے۔ زیادہ مقدار کا یہی اثر تھا جو اس مریض پر ظاہر ہُوا۔ نسخے میں ڈاکٹر نے یہ دوائی لکھی ہی نہیں تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ تیار کی۔ اس کی تصدیق یا تردید ایگزامینر کو کرنی تھی۔

فرار کے راستے

میں تھانے گیا۔ ڈسپنسر حوالات میں بند تھا۔

"اقبالی بیان دو گے یا مقدمہ لڑو گے" ــــ میں نے اُس سے پوچھا ــــ "میری نصیحت پر عمل کرو گے تو شاید کچھ چھوٹ مل جائے۔ تم جرم کو چھپا نہیں

سکو گے۔"

"اِس آدمی نے مجھ پر جوابی حملہ کیا ہے" — اُس نے کہا — "وہ پہلے ہی بیمار تھا۔ اُس کی تکلیف بڑھ گئی تو مجھ پر الزام عائد کر دیا کہ میں نے اُسے دوائی میں کچھ دے دیا ہے۔"

"تم دو چار دن اندر بیٹھے رہو" — میں نے کہا — "مجھے اُمید ہے کہ اچھی طرح سوچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

مجھے دوائی کی رپورٹ کا بے تابی سے انتظار تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مولوی کو بھی اس واردات میں پھانسوں۔ سوچ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ مولوی کو اعانتِ جرم میں پکڑا جا سکتا ہے۔ اُس کے خلاف شہادت موجود تھی۔ اُس نے لوٹا گھمانے میں دھوکہ دہی کا ارتکاب کیا تھا۔ اس شخص کے خلاف غصّے سے میں اس قدر بھرا ہُوا تھا کہ میں نے اُسے تھانے بُلا لیا اور اُس کمرے میں بند کر دیا جس میں ملزموں سے پُوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ زیادہ غصّہ اس بات پر تھا کہ وہ مذہب اور مسجد کی توہین کا مرتکب ہو رہا تھا اور وہ قرآن کی آیات پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ دے رہا تھا۔ وہ بعد میں بری ہی ہو جاتا لیکن میں اسے رگڑا دینا چاہتا تھا۔

مخبر رپورٹیں لے کر آنے لگے۔ گاؤں میں اور شہر کے کسی بھی محلّے میں کسی کے گھر کی کوئی بات چھُپی نہیں رہتی۔ ہم لوگوں کی یہ عادت ہے کہ اپنی کرتوت سے دوسروں کی توجہ ہٹانے کے لیے دوسروں کے متعلق ذرا سی بات کا بتنگڑ بناتے اور اسے مشہور کرتے ہیں۔ ہم سب میں دوسروں کے گھروں کی باتیں جاننے کا تجسّس ہوتا ہے۔ کسی کا پردہ نہیں رہتا۔ دلوں میں چھُپے ہوئے بھید بھی

باہر آجاتے ہیں۔ اِن حالات میں مخبروں کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مخبروں کی اپنی نظر بھی بہت دُور تک اور رستوں کے پیچھے تک دیکھ سکتی ہے۔

ڈسپنسر کے متعلق مخبروں نے بتایا کہ بدمزاج اور غصیلا ہے۔ غصّے میں اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ تو مجھے ڈاکٹر بھی بتا چکا تھا کہ یہ شخص بدمزاج ہے۔ مخبروں کی رپورٹ کے مطابق گھر میں وہ ظالم ڈکٹیٹر بنا رہتا ہے۔ جوان اولاد کی پٹائی کر دیتا ہے۔ بیوی کو مارتا پیٹتا ہے۔ مذہب اور پردے کا اتنا پابند کہ اُس کا بس چلے تو باہر کی ہوا کو بھی اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ اُس کے گھر سے اُس کے سوا کسی اور فرد کی آواز کبھی نہیں سنائی دی۔ اس کے بڑے بیٹے کے متعلق بتایا گیا کہ اُس کا میل جول بدقماش لوگوں سے ہے۔ گھر والوں سے چوری سگریٹ پیتا ہے۔ اُسے جوا کھیلتے بھی دیکھا گیا ہے۔ ایک مخبر نے یہ بھی بتایا کہ وہ دفتر میں بھی جوا چلا لیتا ہے۔ وہ تحصیل کے دفتر کا ملازم ہے جہاں کچھ بالائی آمدنی بھی ہوتی تھی۔

اس پچیس سالہ جوان اور غیر شادی شدہ بیٹے کے متعلق یہ رپورٹ سُن کر میں بالکل حیران نہیں ہُوا۔ اب اس عمر تک تو مجھے بہت تجربہ حاصل ہو چکا ہے، اُس وقت جب میں جوان تھا مجھے کتابوں نے کچھ بتایا تھا۔ ان کی روشنی میں یہ حیران کُن نہیں تھا کہ جس باپ نے گھر میں ڈکٹیٹروں جیسا ڈسپلن قائم کر رکھا تھا اُس کا بیٹا جوئے باز ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن بچّوں میں مجرمانہ رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں، وہ ایسے ہی ڈکٹیٹر باپوں کے بچے ہوتے ہیں۔ اتنا تشدد اور اتنی کڑی پابندیاں جیسی اس باپ نے گھر میں روا رکھی ہوئی تھیں،

انسانی فطرت قبول نہیں کیا کرتی۔ حکم کے ساتھ پیار بھی ہو تو تربیت میں وہ اعتدال پیدا ہو جاتا ہے جو بچے کو متوازن شخصیت عطا کرتا ہے۔ اذیت اور اذیت ناک ماحول سے انسانی فطرت فرار حاصل کرتی ہے۔ ڈسپنسر کا بڑا بیٹا اسی فرار کا عادی ہو گیا تھا۔

اس سے چھوٹے بھائی کا ردِ عمل مختلف تھا۔ اُس کے متعلق بتایا گیا جیسے اُس کا تو من ہی مار آگیا ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے بندروں کی طرح کودتے پھلانگتے رہتے ہیں مگر یہ لڑکا چُپ چاپ رہتا تھا۔ ہمجولیوں کو کھیلتے دیکھتا رہتا تھا ان کے ساتھ کھیلتا نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر ہر وقت کوئی خوف طاری رہتا ہے۔ یہ دراصل دوسری قسم کا ردِ عمل تھا۔ بڑا بیٹا چوری چھپے آزاد ہو گیا تھا اور اُس نے فرار کا مجرمانہ راستہ اختیار کر لیا تھا۔ چھوٹے بیٹے نے اپنی ذات کے اندر پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہوتی ہیں۔

میں والدین کو یہ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے بچوں کے دشمن کبھی نہ بنیں۔ انہیں کسی غلط حرکت سے روکیں تو گالیاں دینے یا مارنے پیٹنے کی بجائے انہیں بتائیں کہ یہ حرکت کیوں غلط ہے۔ انہیں خود بھی بھلا بُرا سوچنے کا موقع دیں اور انہیں سوچنے میں مدد دیں۔ تشدد آمیز اور آمرانہ سلوک کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ آپ کسی تھانیدار سے پوچھیں میں آپ کو جو واردات سُنا رہا ہوں اسے صرف تفریحِ طبع کے لیے نہ پڑھیں، اس سے کوئی سبق حاصل کریں۔

ماں اور بیٹیاں

مخبر عورت جو مخبر عورت تھی اُس نے ڈسپنسر کی بڑی بیٹی کے متعلق ایسی رپورٹ دی جو آپ کو چونکا دے گی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ اتنی سخت پابندیوں اور پردے کی وجہ سے اُسے باہر کی ہوا بھی نہیں لگتی ہو گی مگر وہ کوٹھوں کی عشق بازی کرتی تھی۔ آپ انسان کو قید کر سکتے ہیں اُس کے تصوروں کو زنجیریں نہیں ڈال سکتے۔

یہاں میں پھر وہی بات کہوں گا کہ انسانی فطرت آزادی پسند ہے۔ اسے قید میں جتنا ڈالو اس کی آزادی پسندی اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ پردہ دار لڑکیاں جنہیں ماں باپ برقعے میں بھی باہر نہیں نکلنے دیتے کوٹھے پر چلی جاتی اور آزاد دنیا کو دیکھ لیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان سب کی نیت خراب ہوتی ہو۔ البتہ جن لڑکیوں کے باپ ڈسپنسر جیسے ہوتے ہیں وہ لڑکوں کی طرح کھچے ہوئے اعصاب اور گھٹن سے ذرا نجات حاصل کرنے کے لیے قید میں رہتے ہوئے بھی آزاد ہو جاتی ہیں۔ کوٹھوں کی نظر بازی اور دُور دُور کی محبت اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شہروں کے گنجان محلوں کے لوگ محبت کی اس نوعیت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔

مخبر عورت نے بتایا کہ ڈسپنسر کے گھر کا بیت الخلا کوٹھے پر ہے۔ ڈسپنسر کی بڑی بیٹی دن میں دو تین بار اُوپر جاتی ہے۔ چار پانچ گھر دُور کے

ایک کوٹھے پر ایک نوجوان اُس کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ دونوں فصیلوں کی اوٹ سے اشاروں میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس عورت نے وثوق سے بتایا کہ کوٹھوں کے اُوپر اُوپر سے ان دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ اُس نے ان ملاقاتوں کی تصدیق کرائی تھی۔ مجھے اس عورت پر اعتماد تھا۔ آسمان سے تارے توڑ لانے والی عورت تھی۔ اُس نے ڈسپنسر کی چھوٹی بیٹی کے متعلق صاف رپورٹ دی۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی طرح دِلی طور پر مُردہ ہوگئی تھی۔

مجھے ایسی ہی رپورٹوں کی توقع تھی۔ معاملہ صاف تھا۔ بڑا بیٹا چور کا عادی ہوگیا تھا۔ ہار اور نقدی کی چوری اُس کے کھاتے میں جاتی تھی۔ اگر آپ نفسیات کا مطالعہ کریں تو بڑے بیٹے کا نفسیاتی تجزیہ آسان ہوجائے گا۔ اس قسم کے ماحول اور حالات کے پروردہ بچے پیسوں کے لالچ سے گھر میں چوری نہیں کیا کرتے بلکہ یہ اُن کی لاشعوری کارروائی ہوتی ہے جس میں ظالم باپ کے خلاف انتقام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ گھر سے چوری کرکے مال غائب کر دیتے ہیں۔ یہ ایک خبط ہوتا ہے جسے نفسیات کی زبان میں KLEPTOMANIA کہتے ہیں۔

میں اس شک میں حق بجانب تھا کہ ہار اور نقدی کا چور یہی لڑکا ہے۔ بڑی لڑکی پر بھی شک کیا جاسکتا تھا۔ اگر واقعی ایک نوجوان اُس سے ملتا تھا تو امکان تھا کہ لڑکی نے ہار اور نقدی نکال کر لڑکے کو دے دی ہو لیکن میرا وہم بڑے بیٹے سے ہٹتا نہیں تھا۔

ڈسپنسر حوالات میں بند تھا۔ میں اُس کے گھر جاکر ہر کسی سے آسانی سے مل سکتا تھا۔ مجھے روک تو کوئی بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر ڈسپنسر آزاد ہوتا تو ہنگامہ بپا کر دیتا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اُس کے بڑے بیٹے کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ فوراً گھر پہنچے۔ مجھے معلوم تھا اور ہر تھانیدار کو اپنے علاقے میں معلوم ہوتا ہے کہ عادی جوئے باز کون کون ہیں۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی۔ سے کہا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ چند دن پہلے ڈسپنسر کے بیٹے نے کوئی بڑی بازی لگائی تھی؟

میں ڈسپنسر کے گھر پہنچا گیا۔ اُس کی بیوی میرے سامنے نہیں آرہی تھی۔ بڑی مشکل سے سامنے آئی مگر اکیلی نہیں، اُس کی دونوں بیٹیاں بھی سامنے آگئیں۔ وہ شاید ماں کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

میں نے اُن سے کہا کہ ڈسپنسر باہر رہتا ہے، بڑا بیٹا بھی دفتر چلا جاتا ہے، پیچھے عورتیں رہ جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دن کے دوران کوئی آکر چوری کرجائے؟ میں نے دیکھا کہ میرے سوال کے جواب میں اُن کے ذہن بالکل خالی تھے۔ میں نے رات کا ذکر کیا اور کہا تم سب برآمدے میں سوتے ہو۔ اس حالت میں بھی چوری ممکن نہیں۔ پھر اُس عورت کے متعلق پوچھا جس کے نام پر مولوی نے لوٹا گھمایا تھا۔ میرے کئی ایک سوالوں کے بعد ڈسپنسر کی بیوی نے صاف کہہ دیا کہ اُسے عورت پر شک نہیں۔

مجھے ماں اور بیٹیوں سے کوئی ایسی بات نہ ملی جو مجھے سراغرسانی میں مدد دیتی۔ میں نے دونوں بیٹیوں کو غور سے دیکھا۔ بڑی بیٹی ماں اور چھوٹی بہن

کی نسبت زیادہ باتیں کرتی تھی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے اُس کے ساتھ چند ایک باتیں کیں کہ اُس میں کتنی کچھ دلیری ہے۔ اُس میں حجاب تھا۔ شرم بھی تھی لیکن میں نے اُس کی باتوں میں خاص قسم کی پختگی دیکھی جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ان تینوں نے میرے پُوچھنے پر صاف بتایا کہ ڈسپنسر گھر میں قیامت بپا کیے رکھتا ہے اور ہر کسی کو مارتا پیٹتا ہے۔ چند دن پہلے اُس نے بڑی بیٹی کو بہت مارا تھا۔

"آپ کا ہار اور رقم اس گھر سے نکل گئی ہے"— میں نے انہیں کہا —"لیکن میں آپ کو یقین سے کہتا ہوں کہ چور ابھی تک اس گھر سے نہیں نکلا"— میں یہ بات کہتے ہوئے بڑی بیٹی کی طرف دیکھ رہا تھا— "چور اس گھر میں ہے"— میں نے بڑی بیٹی کے چہرے کا رنگ صاف طور پر بدلتے دیکھا اور وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح پیچھے ہٹی جیسے میں اُسے پکڑ لونگا۔

وہ کوٹھے پر پکڑے گئے

چہرے کے تاثر کی یہ تبدیلی شاید ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تجربہ دکھا دیتا ہے۔ مجھے مجرموں اور گواہوں کے چہروں اور اُن کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھنے کا تجربہ تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کی تبدیلی کو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اتنے میں اُس کا بڑا بھائی آگیا۔ میں نے اُس کی ماں اور بہنوں کو وہاں سے اُٹھا دیا اور اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ہے میرا

ملزم۔

میں نے اُس پر فوراً حملہ نہیں کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہا — "سُنا ہے آپ کے والد صاحب گھر میں تشدد کرتے ہیں اور کسی کو بخشتے نہیں"۔

"تشدد نہیں ظلم کہیں"— اُس نے کہا اور مجھے تفصیل سے بتایا کہ باپ نے گھر میں کیا فضا بنا رکھی تھی۔ اُس نے کہا — "گھر ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اُس وقت گھر آؤں جب باپ گہری نیند سویا ہُوا ہو"۔

"تم دفتر کے علاوہ کہاں وقت گزارتے ہو"؟

"دوستوں کے ساتھ"— اُس نے جواب دیا — "گپ شپ میں"۔

"بازی کہاں لگتی ہے"؟— میں نے مُسکرا کر پُوچھا — "اُستادوں کے ساتھ یا دوستوں کے ساتھ"؟

وہ کچھ گھبرایا اور بولا — "میں پیشہ ور جواری تو نہیں، شغل کے لیے تاش کھیلتے ہیں اور دو چار روپے بازی بھی لگا لیتے ہیں"۔

میں نے بہت کریدا۔ گھما پھرا کر سوال کیے مگر جو بات میں تلاش کر رہا تھا وہ نہ ملی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ پیشہ ور جواری میرے جانے پہچانے ہیں، میں اُن سب سے پوچھوں گا اس لیے وہ سچ بتا دے۔ اُس نے غرور اعتمادی سے کہا کہ پوچھ لیں۔

"اگر میں تمہیں کہوں کہ ہار اور نقدی کے چور تم ہو تو کیا جواب دو گے"؟

"آپ مجھے چور کہہ سکتے ہیں کیونکہ آپ تھانیدار ہیں"— اُس نے

کہا "میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"سُنا ہے چند دن ہوئے تمہاری بہن کو تمہارے باپ نے بُری طرح پیٹا تھا" ___ میں نے کہا ___ "کیا وجہ تھی؟ کوئی برتن ٹوٹ گیا تھا یا کوئی اور بات ہوئی تھی؟"

"اگر میں آپ کو اصل وجہ بتا دوں تو آپ میری کچھ مدد کریں گے؟" ___ اُس نے سر جُھکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ اُس نے جب سر اُٹھایا تو میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اُس نے کہا ___ "ہم بہن بھائی اور ہماری ماں مظلوم ہیں۔ ہم گھر میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بُزدل ہو گیا ہوں۔ ہمارے محلے میں مجھ سے دو تین سال چھوٹا ایک نوجوان ہے وہ اپنے کوٹھے سے میری بہن کو اشارے کرتا رہتا ہے۔ ایک رات بہن اُوپر بیت الخلا میں گئی۔ ہم سوئے ہوئے تھے۔ میرے باپ کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ اُوپر چلا گیا اور اُس نے میری بہن کو بہت پیٹا۔ پیٹتے پیٹتے نیچے لے آیا۔ ہم میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اسے چھڑاتا۔۔۔۔ معلوم ہُوا کہ وہ نوجوان ہمارے کوٹھے پر آ گیا تھا اور میرے باپ نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ وہ نوجوان بھاگ گیا اور بہن کی مصیبت آ گئی۔۔۔۔ وہ نوجوان دلیر اور بدمعاش ہے۔ امیر گھرانے کا ہے۔ ہم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ اگر اُسے ڈرا دھمکا دیں تو ہماری عزت محفوظ رہ سکتی ہے۔"

میں نے وعدہ کیا کہ میں اس نوجوان کو تھانے بلاؤں گا۔

ڈسپنسر کے اس بیٹے سے میں نے بہت پوچھ گچھ کی۔ وہ نہ مانا۔ مجھے

جواریوں کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ اُن سے ہار کے متعلق پتہ چل سکتا تھا۔ ہار نہیں تو یہی پتہ چل سکتا تھا کہ اس آدمی نے بہت زیادہ رقم کی بازی لگائی تھی۔ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ وہ پیشہ ور جواریوں کے ساتھ کھیلتا ہے یا اُس کے اپنے بیان کے مطابق وہ شغل کے طور پر دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ چوری کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ میں اُٹھا اور تھانے چلا گیا۔ مولوی کو جا کے دیکھا۔ اُس کے بَل نکل گئے تھے۔

"وہ عورت چور ہے مولانا؟" ___ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر ہنس نہ سکا۔ میں نے اور کچھ بھی نہ کہا۔ کمرے سے باہر آ گیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ شام کو ہسپتال گیا۔ اس عورت کا خاوند بچ نکلا تھا مگر لاش بن گیا تھا۔ اُس سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ ابھی بیان دینے کے قابل نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے دیکھ کر میں کچھ ایسا جذباتی ہو گیا کہ یہ عہد کر لیا کہ اس نوسرباز کو جو مولوی اور غیب دان بنا ہُوا تھا اس آدمی کی طرح لاش بنا کر چھوڑوں گا۔ میں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ اقبالی بیان دینے کے موڈ میں آ گیا تھا لیکن میں ابھی اسے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

بہن غائب ہو گئی

میں نے ڈسپنسر کے گھر کے افراد سے باتیں کر کے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔

یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ چور اس گھر میں موجود ہے۔ یہ بڑا بیٹا ہو سکتا تھا اور بڑی بیٹی بھی۔ بیٹی کے متعلق یہ ہو سکتا تھا کہ اُس نے چوری کر کے مال اس نوجوان کو دے دیا ہو جسے وہ چاہتی ہے۔ مجھے توقع نہیں کہ ایسا ہُوا ہو گا۔ یہ ممکن تھا یعنی ایسا ہونے کا امکان تھا۔ یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ یہ نوجوان اس لڑکی سے ملتا تھا اور وہ لو فر لفنگا بھی تھا۔ لڑکی کے دل میں باپ کے خلاف انتقام کا جذبہ بھی تھا۔ بہرحال مشتبہ افراد کی فہرست میں یہ لڑکی اور اُس کا چاہنے والا بھی شامل تھا۔ اس گھر میں ایک چھوٹا لڑکا (تیرہ چودہ سال کا) بھی تھا۔ میں نے اُسے بھی نظرانداز نہیں کیا۔

رات کو مجھے رپورٹ ملی کہ ڈسپنسر کا بڑا بیٹا پیشہ ور جواریوں کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ وہ اُسے جانتے ہی نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ معمولی قسم کا جوئے باز تھا۔ مجھے اُس کے دوستوں سے ملنا تھا جن کے ساتھ وہ جوا کھیلتا تھا۔ یہ فہرست یہ آدمی مجھے خود ہی دے سکتا تھا۔ میں نے اسے بھی نظرانداز نہیں کیا۔

اگلے روز کانسٹیبل دوائی کی تجزیاتی رپورٹ لے کر آ گیا۔ اس میں ایک زہریلی آمیزش تھی۔ قے کی کچھ مقدار بھی تجزیئے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہی آمیزش اس میں بھی پائی گئی۔ ڈسپنسر کے خلاف شہادت مکمل تھی۔ میں اس کوشش میں تھا کہ مولوی کے خلاف اعانتِ جُرم ثابت ہو جائے۔ ایسا مواد تو مِل گیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایسے حالات اس شخص نے پیدا کیے ہیں جن سے متاثر ہو کر ڈسپنسر نے ایک آدمی کو زہر دے کر قتل کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اُس کی فریب کاری کی شہادت بھی مِل گئی تھی۔

میں نے رپورٹ ڈاکٹر کو دکھائی۔ ڈاکٹر موقعہ کا گواہ تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی تھا، لہٰذا مستند گواہ تھا۔ ڈاکٹر نے میری کچھ اور راہنمائی کی اور ہم نے زبانی زبانی کیس تیار کر لیا۔ میں نے حسبِ معمول آدھی رات کے بعد ڈسپنسر سے اقبالی بیان لینے یا اسے بیان دینے کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولوی کو بھی اسی وقت لپیٹ میں لینا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل اُس نوجوان کو بُلا لانے کو بھیجا جس کے ساتھ ڈسپنسر کی بیٹی کے درپردہ تعلقات تھے۔

کانسٹیبل بہت دیر بعد واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ گھر نہیں ملا۔ اُس کے گھر والوں سے کانسٹیبل کہ آیا تھا کہ وہ جونہی آئے اُسے تھانے بھیج دیں میں نے ڈسپنسر کے بڑے بیٹے کو بلانے کے لیے کانسٹیبل بھیجا۔ اُس سے پوچھنا تھا کہ اُس کے جوئے باز دوست کون کون سے ہیں۔ بُلانے کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔

بعض تھانیداروں کا یہ طریقہ کار ہوتا ہے کہ وہ کسی مشتبہ کو تھانے میں ہی پابند رکھنے کی بجائے اُسے بار بار تھانے بلاتے ہیں۔ ایک باوردی کانسٹیبل بار بار اُس کے گھر جاتا ہے۔ کبھی آدھی رات کو جا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اُسے تھانے بلا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ بڑے پیار سے اُس پر دہشت طاری کر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح اُس پر تشدد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُس کا اعصابی نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور بصد شُکریہ سینے کے راز تھانیدار کے حوالے کر دیتا ہے۔ میں نے ڈسپنسر کے بیٹے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے کی ٹھان لی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے پوچھنے پر وہ ایک ہی

بار اپنے تمام جوئے باز دوستوں کے نام بتا دے گا۔

وہ آگیا۔ میں اُس پر بڑا اچھا تاثر چھوڑ آیا تھا۔ اس کے دل میں تھانیدار کا جو ڈر تھا وہ میں نے نکال دیا تھا، لیکن میں نے اُس کے چہرے پر جو تاثرات دیکھے وہ خوف کے بھی تھے پریشانی کے بھی۔ مجھے آج تک اُس کا چہرہ یاد ہے۔ اُسے بٹھایا۔ خیر خیریت پوچھی۔ اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں سمجھا کہ جرم اسے ملامت کر رہا ہے اور یہ میرے آگے اپنے ضمیر سے بوجھ اُتار پھینکے گا مگر جُرم کے بوجھ کی بجائے اس نے مجھ پر ایک بم پھینک دیا۔ میں کچھ دیر اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"مصیبت اکیلی نہیں آتی" — اُس نے کہا — "اتنا قیمتی ہار چوری ہو گیا۔ تین سو روپے نکل گئے۔ ابا جان اتنے سنگین جرم میں اندر ہو گئے۔ رات میری بہن غائب ہو گئی ہے۔"

"بڑی یا چھوٹی؟"

"بڑی" — اُس نے جواب دیا — "صبح وہ بستر پر نہیں تھی۔ اُوپر دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھی۔ دو ہی تو جگہیں تھیں۔ اُوپر یا نیچے۔ ایک دو گھروں سے پتہ کرایا۔ بیکار تھا۔ اتنی سویر سے اُسے کسی کے گھر کیوں جانا تھا بہت سوچا کیا کریں۔ میں اس لڑکے کے گھر گیا جس کے ساتھ اسے میرے باپ نے کوٹھے پر پکڑا تھا۔ وہ نہ ملا۔ اب تک تین بار اُس کے گھر جا چکا ہوں۔ وہ نہیں مل رہا۔"

"وہ کوئی پیسے اور زیورات بھی لے گئی ہے؟"

"نہیں۔"

"تم میرے پاس کیوں نہیں آئے؟" — میں نے پوچھا — "رپورٹ نہیں کرنی تھی؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی" — اُس نے کہا — "بے عزتی کے سوا کیا حاصل ہوگا؟ اگر یہ لڑکا بھی گھر سے غائب ہے تو میری بہن اسی کے ساتھ گئی ہے۔"

وہ نوجوان بھی لاپتہ ہو گیا

ڈسپنسر کی ظالمانہ ڈکٹیٹر شپ نے اپنے پچیس سالہ بیٹے میں اتنی سی بھی مردانگی پیدا نہیں ہونے دی تھی کہ وہ اس صورتِ حال کے متعلق کچھ سوچ بھی سکتا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ابا جان کو بتا دوں؟ میں نے اُسے کہا کہ وہ حوالات میں بند ہے۔ اپنا خون پینے کے سوا کیا کرے گا۔ اُسے ابھی نہ بتاؤ.... میں اس بیٹے کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نام سے اس کی بہن کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی اور اسے ان الفاظ میں تسلی دی — "مجھے اپنا باپ سمجھو اور گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔"

اُس کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے کہا — "اپنے اُوپر اتنا زیادہ بوجھ نہ لو۔ اگر گھر سے ہار اور نقدی تم نے نکالی ہے

تو مجھے بتا دو۔ میں یہ کیس گول کر دوں گا۔ اب توجہ اپنی بہن کی برآمدگی پر اور اپنے باپ کا مقدمہ لڑنے پر مرکوز کر لو۔"

اُس نے جس انداز سے قسمیں کھائیں، میں مان گیا کہ اس نے چوری نہیں کی۔ اس سے بہت زیادہ باتیں ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا جیسے میری پناہ میں چھپ جانا چاہتا ہو۔ میری ہمدردی سے وہ چھوٹا سا بچہ بن گیا۔ اُس نے اپنے باپ کے متعلق پوچھا کہ اُس کا کیا بنے گا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ اس کے باپ کی قسمت میں چار پانچ سال کی سزائے قید لکھ دی گئی ہے۔

"مجھے اس شخص کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں" — اُس نے کہا۔

میں نے اسے گھر بھیج دیا۔ مجھے اب لڑکی ڈھونڈنی تھی۔ وہ گزشتہ رات نکلی تھی۔ اب اگلی رات شروع ہو چکی تھی۔ میں نے یہ رپورٹ خود ہی اپنے سر ڈال لی تھی۔ اس میں میرا جنون بھی شامل تھا اور ہمدردی بھی۔ میں نے یہ یقین کرنے کے لیے کہ لڑکی اسی نوجوان کے ساتھ گئی ہے ایک کانسٹیبل کو اُس کے گھر یہ کہہ بھیجا کہ وہ نہ ملے تو اس کے باپ کو بلا لائے۔ میں نے اتنی دیر میں غسل کر لیا اور کچھ کھا پی لیا۔

اُس کا باپ میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس کے بیٹے کے متعلق پُوچھا تو اُس نے پہلے تو لاعلمی ظاہر کی پھر جھوٹ بولا۔ میں نے جب پولیس والوں کا لہجہ استعمال کیا تو اس نے بتایا کہ وہ رات کو کہیں نکل گیا تھا، واپس نہیں آیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس سے

پہلے وہ بغیر بتائے کبھی اتنی دیر تک غیر حاضر نہیں ہُوا تھا۔

"ڈسپنسر نے کبھی تم سے شکایت کی تھی کہ تمہارا بیٹا اُس کی بیٹی کو اپنے کوٹھے سے اشارے کیا کرتا ہے؟"

"تین بار اُس نے شکایت کی تھی" — اُس نے جواب دیا۔

"تم نے اپنے بیٹے کو ان بیہودہ حرکتوں سے منع کیا تھا؟"

"میرا بیٹا!" — اُس نے گالی دے کر جواب دیا — "سرکش اور دلیر ہے۔ اسے کچھ کہو تو مرنے مارنے پر آجاتا ہے۔"

مختصر یہ کہ صبح کانسٹیبل اُس کے بیٹے کو بلانے گیا تھا تو اس شخص نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ وہ دراصل ڈسپنسر کی بیٹی کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یہ نظر آنے لگا تھا کہ ہار اور نقدی لڑکی اور لڑکا لے گئے ہیں، لیکن ہار ایک ہفتہ پہلے چوری ہُوا تھا، تو کیا چور کوئی اور ہے؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ لڑکی کو بھی بہرحال تلاش کرنا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دونوں وارداتیں الگ الگ ہیں یا ان کا آپس میں تعلق ہے۔

سزا جو خدا نے دی

رات گزر رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد مجھے ڈسپنسر سے دو ہاتھ کرنے تھے۔ ابھی وقت تھا۔ آدھی رات کے بعد اس سٹیشن پر دو منٹ رُک کر ایک مسافر گاڑی گزرتی تھی۔ بھاگنے والے اسی گاڑی سے گئے

ہوں گے۔ میں ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ بکنگ کلرک کو کوارٹر سے سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بلایا۔ اُس سے پوچھا کہ گزشتہ رات یہاں سے کسی نے دو ٹکٹ خریدے ہوں گے۔

اُس نے کاغذات دیکھ کر بتایا۔ مجھے تعداد یاد نہیں رہی۔ دو سے زیادہ ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ کلرک کو کسی ایک کا بھی چہرہ یاد نہیں تھا۔ اُس نے کوئی عورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس دَور میں رَش کا یہ عالم نہیں ہوتا تھا جو آج کل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے سے قصبے کے سٹیشن پر رات کے پچھلے پہر کی گاڑی سے کون آتا جاتا تھا۔

میں نے ٹکٹ کلکٹر کو بھی بلا لیا۔ اس آدمی کو بھی بلا لیا جو گاڑی کے ڈرائیور کو گولہ (ٹوکن) دیتا ہے۔ دو اور آدمی مِل گئے جو پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ان میں سے دو نے بتایا کہ انہوں نے ایک نوجوان کو ایک برقعہ پوش عورت کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے وہ اس نوجوان کو پہچان نہیں سکے تھے۔ بکنگ کلرک نے یاد کرنے کی اور زیادہ کوشش کی۔ اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ یہ نوجوان اُسے یاد آ رہا ہے۔ اُس نے دو ٹکٹ خریدے تھے۔

میں نے اس کا ریکارڈ دیکھا۔ دو ٹکٹ ایک ہی سٹیشن کے تھے اور باقی الگ الگ سٹیشنوں کے دو ٹکٹ تیس میل دُور کے ایک شہر کے تھے جو کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔

مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہاں اس نوجوان کا کوئی دوست ہے یا وہ

اللہ کے بھروسے لڑکی کو ساتھ لے گیا ہے۔ میں تھانے واپس جاتے ہوئے اُس کے گھر چلا گیا۔ اُس کے باپ اور بڑے بھائی سے پوچھا کہ اس شہر میں اس کا کوئی دوست ہے؟

اس کے بھائی نے بتایا کہ اس قصبے کا ایک نوجوان وہاں ملازم ہے اور وہ دو تین مہینے ہوئے شادی کر کے اپنی بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ دوستی گہری بتائی گئی تھی۔

میں آپ کو ایسی ایک دو کہانیاں سُنا چکا ہوں جس میں ایک آدمی لڑکی کو بھگا لے گیا اور اسے اپنے دوست کے گھر رکھا۔ اس واردات میں بھی ایسے ہی ہوا ہوگا۔ میں نے اس دوست کا گھر پوچھ لیا۔

میں تھانے چلا گیا۔ ارادہ یہ کیا کہ صبح اس نوجوان کے دوست کا ایڈریس اُس کے گھر والوں سے پوچھوں گا۔ میں نے ڈسپنسر کو حوالات سے نکلوایا اور اُسے اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو چکی ہوگی۔

"مجھے تمہارے اقبالی بیان کی کوئی ضرورت نہیں" — میں نے اُسے کہا — "تمہارا جُرم ثابت ہو چکا ہے"۔

"وہ مر تو نہیں گیا؟" — اُس نے پُوچھا۔

"تُم نے کسر تو نہیں رہنے دی تھی" — میں نے کہا — "اللہ نے اسے بچا لیا ہے لیکن اُسے مرا ہُوا ہی سمجھو۔ غریب آدمی ایک سال تک کام کرنے کے قابل نہیں رہا" — میں نے طنزیہ لہجے میں کہا — "جس مذہب

کے تم جنونی ہو وہ مذہب تمہیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی انسان کی جان لے لو؟ میں تمہیں اگر رہا بھی کر دوں تو تم خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے"۔۔۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔ "خدا کی بے آواز لاٹھی چل چکی ہے۔ تم جس بیٹی کو پردوں میں چھپا کر رکھتے تھے وہ ایک آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے"۔

اُسے ایسا دھچکہ لگا جو میں نے بھی محسوس کیا۔ اُس کا گندمی چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ اُس کی زبان جیسے اکڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور مجھ پر جمی رہیں۔

"اب جھوٹ بول کر خُدا کے قہر میں اضافہ نہ کرو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اپنے گناہ کا اعتراف کرو۔ شاید خُدا تمہیں بخش دے"۔

اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ میں نے اُس کے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ لیا ہے اور خود ہی اس کی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ کر کارروائی شروع کر دی ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میں بہت جلد اُس کی بیٹی کو برآمد کر لوں گا اور وہ جس کے ساتھ گئی ہے اُس کے خلاف اغوا کا کیس بناؤں گا۔

اُس کے اقبالی بیان کی ضرورت نہیں تھی۔ ثبوت اور شہادت مستند اور قابلِ اعتبار تھی۔ میں دراصل اس مولوی کے خلاف اس سے بہت کچھ کہلوانا چاہتا تھا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ اُس نے بیان دے دیا۔ ں میں وہی کچھ تھا جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ میں نے جرح کے

ذریعے اور اسے لقمے دے دے کر مولوی کے خلاف ضرورت کی باتیں کہلوالیں۔ مثلاً یہ کہ ڈسپنسر کو کئی بار خیال آیا کہ جس عورت کے نام پر لوٹا گھوما ہے، وہ چوری کس طرح کر سکتی تھی۔ اسے ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے مولوی سے بات کی تو مولوی نے قرآن کا رُعب دے کر اور چرب زبانی سے ڈسپنسر کو قائل کر لیا کہ چوری اسی عورت نے کی ہے۔

بیان میں یہ بھی کہلوالیا کہ اس عورت پر شک کا اظہار ڈسپنسر نے نہیں مولوی نے کیا تھا۔ میں نے ڈسپنسر سے یہ بھی منوا کر کہلوالیا کہ مولوی نے اسے اسلام کے حوالے سے اس عورت اور اس کے خاوند کے خلاف بھڑکایا تھا۔

ڈسپنسر سے میں فارغ ہُوا تو مرغ اذانیں دے رہے تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ اب مولوی کی باری تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مولوی کو اس وقت لپیٹ میں لے لیتا۔ میں سونے کے لیے چلا گیا اور ایسا سویا کہ صبح نو ساڑھے نو بجے آنکھ کھلی۔ کسی نے جگایا نہیں۔ تھانہ اسے۔ ایس۔ آئی نے سنبھالے رکھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے دفتر میں گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ضلع سے ایک انگریز پولیس انسپکٹر آگیا۔ یہ اُس کا اچانک دَورہ تھا جسے چھاپہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ میں کچھ دیر پہلے جاگ کر دفتر میں آگیا تھا ورنہ محکمانہ کارروائی ہو جاتی۔ انسپکٹر نے معائنہ شروع کر دیا اور اُس نے فرمائش کر دی کہ وہ دیسی کھانا کھائے گا۔ میں نے انتظام کیا، اُسے دوپہر کا کھانا کھلایا اور وہ پچھلے پہر روانہ ہُوا۔ میرے کاموں میں تاخیر ہو گئی۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ ڈسپنسر کو مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان قلمبند کرانے کے لیے لے جائے اور اُسے جوڈیشل حوالات (جیل) میں چھوڑ آئے۔ روانگی کے وقت میں نے ڈسپنسر سے وعدہ کیا کہ کم سے کم سزا دلاؤں گا اور اُس کی بیٹی کو برآمد کروں گا اور اُس کے گھر کا بھی خیال رکھوں گا۔

"خُدا کے سوا میرے بیوی بچوں کا کوئی نہیں" — اُس نے روتے ہوئے کہا — "آپ پولیس انسپکٹر ہیں۔ میں آپ سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ آپ میرے گھر کا خیال رکھیں گے۔"

"اُسی طرح خیال رکھوں گا جس طرح تم رکھتے تھے" — میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے کہا — "میں مسلمان ہوں اس کفرستان میں میرا فرض ہے کہ ایک مصیبت زدہ مسلمان گھرانے کا خیال رکھوں۔"

اُس کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی۔ میرے جذباتی سہارے نے بہت کام کیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اس نے جو بیان مجھے دیا ہے وہی مجسٹریٹ کو دے ورنہ اُسے نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ اُس نے پُرزور الفاظ میں وعدہ کیا کہ وہ میری نصیحت پر عمل کرے گا۔

بُرقعے کے آنسو

مجھے اُس دوست کا ایڈریس معلوم کرنا تھا جس کے متعلق شک

تھا کہ لڑکی کو وہاں رکھا گیا ہوگا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ بھگوڑے نوجوان کے گھر سے اُس کے گھر کا پتہ پوچھے اور وہاں کا مطلوبہ ایڈریس لے آئے۔ مجھے اُس شہر کا ایڈریس درکار تھا جہاں وہ ملازم تھا۔

ایڈریس آتے آتے شام ہوگئی۔ مجھے اس ایڈریس پر چھاپہ مارنا یا مروانا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو ضروری عملے کے ساتھ تیار کیا۔ مجھے رات غیب دان مولوی سے بیان لینا اور اسے ایسے شکنجے میں جکڑنا تھا جس سے وہ نکل نہ سکے۔ عین اُس وقت ایک گاؤں سے دو پارٹیوں کی لڑائی کی رپورٹ آگئی۔ اکٹھی پانچ چار پائیاں تھانے میں اُتریں۔ چار شدید زخمی تھے اور ایک مر چکا تھا۔ فوراً بعد دوسری پارٹی کے زخمی آگئے۔ یہ تفتیش والا کیس نہیں تھا۔ کھلی لڑائی ہوئی تھی۔ تاہم کام بہت ہوگیا۔ فوری کارروائی کرنی تھی۔ مجھے رات بھر اس کیس کے لیے جاگنا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی بھی مصروف ہوگیا۔ زخمیوں کے بیان لیے جانے لگے۔ لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوائی۔ معلوم نہیں سورج کب غروب ہُوا۔ رات گزرتی جارہی تھی۔ شام کے بعد کوئی لاری قصبے سے نہیں جاتی تھی۔

اے۔ ایس۔ آئی نے کہا کہ وہ آدھی رات کے بعد کسی گاڑی سے اُس شہر چلا جائے جہاں توقع تھی کہ لڑکی گئی ہوگی۔

آدھی رات سے آدھ پون گھنٹہ پہلے میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا۔ اُسی شہر کا ایک سب انسپکٹر بول رہا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ سکھ زندہ دل ہوتے ہیں اور اپنی مخصوص زبان میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ اس

کی بے تکلفی بھی تھی۔ اس نے مجھے پنجابی میں جو کچھ کہا اس کا اردو ترجمہ یوں ہے ــــ "اوئے ملکا! تم اپنے علاقے کے دانے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے؟ تمہارا ایک پکا ہوا دانہ میرے پاس آگیا ہے۔"

میں نہ سمجھ سکا۔ ہم ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ سکھ کے جواب میں میں نے بھی مذاق شروع کر دیا۔ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ سکھ مجھے کتنی قیمتی رپورٹ دے رہا ہے۔ وہ ننگی زبان بول رہا تھا۔ آخر اُس نے سنجیدگی سے جو اطلاع دی وہ یہ تھی کہ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یعنی آدھی رات سے پہلے اُس کا ایک کانسٹیبل ریلوے سٹیشن پر ڈیوٹی پر گھوم رہا تھا۔ اس کے کسی دوست نے جو اتفاق سے اس تھانے کا مخبر بھی تھا اس کانسٹیبل کو بتایا کہ ایک جوان آدمی ایک لڑکی کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ لڑکی برقعے میں ہے اور وہ رو رہی ہے۔ مخبر شام سے ہی ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ ان دونوں کو اُس نے ایسی حالت میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے دیکھا جیسے ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کہاں جائیں۔ لڑکی کے ساتھی کی پریشانی صاف ظاہر تھی۔ مخبر نے برقعے کا نقاب گرا ہوا ہونے کے باوجود محسوس کر لیا تھا کہ لڑکی رو رہی ہے۔

پولیس کے کسی آدمی کے لیے اور تجربہ کار اور استاد مخبروں کے لیے مشکوک افراد کو بھانپ لینا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ لڑکا لڑکی سٹیشن کے مسافر خانے میں چلے گئے۔ مخبر نے وہاں بھی ان پر نظر رکھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ اُس نے اپنے کانسٹیبل دوست کو دیکھ لیا اور اُس کے ساتھ

ذکر کیا۔ اُس وقت لڑکا لڑکی مسافر خانے کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ کانسٹیبل ان کی طرف چل پڑا۔

لڑکے نے کانسٹیبل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس نے لڑکی کو اُٹھایا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے دونوں باہر کو چل پڑے۔ کانسٹیبل اور مخبر بھی تیز چلے۔ لڑکا لڑکی اور تیز ہو گئے۔ کانسٹیبل نے انہیں پکارا تو وہ اور تیز ہو گئے کانسٹیبل دوڑ پڑا۔ لڑکا بھی دوڑ پڑا مگر لڑکی سے نہ دوڑا گیا۔ لڑکے نے اُسے دیکھا تو وہ واپس آگیا۔ ہمارے لوگ تماشہ دیکھنے فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔ لڑکے نے (جو دراصل بائیس سال کا جوان تھا) کانسٹیبل کو رشوت پیش کی۔ اس کے ساتھ مخبر بھی تھا جو چھوٹی چھوٹی چوریوں کا عادی مجرم بھی تھا۔ کانسٹیبل اور مخبر رشوت سے انکار نہ کرتے بلکہ منہ مانگی رشوت لیتے مگر وہاں لوگ تماشہ دیکھنے اکٹھے ہو گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی۔

مسلمانوں نے برقعہ دیکھا تو اس کے احترام میں بھڑک اُٹھے۔ کانسٹیبل ہندو تھا۔ معاملہ فرقہ وارانہ صورت اختیار کر گیا۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ اس نوجوان اور لڑکی کو تھانے لے جایا جائے۔ مسلمان بھی جوشِ ایمان سے ساتھ چل پڑے اور ہندو بھی۔ کانسٹیبل اور مخبر کی رشوت ماری گئی۔ سکھ تھانیدار نے اس چھوٹے سے سوٹ کیس کی تلاشی لی جو نوجوان اٹھائے پھرتا تھا۔ اس میں سونے کا ایک ہار اور رقم برآمد ہوئی جو تین اور چار سو کے درمیان تھی۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ ان کی ذاتی ملکیت کی اشیاء تھیں۔ تھانیدار نے ان سے ان کے ٹھکانے کے متعلق پوچھا اور اپنے انداز سے پوچھ گچھ کی تو راز

کُھلا کہ دونوں گھروں سے بھاگے ہوئے ہیں۔ دونوں نے میرے قصبے کا نام لیا اور اپنے نام صحیح بتا دیئے۔

ان پر وہاں زیادہ سے زیادہ آوارہ گردی کا الزام عائد ہو سکتا تھا۔ سکھ تھانیدار نے باہر نکل کر مسلمانوں کو بتایا کہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے اور اسے واپس گھر بھیجا جا رہا ہے تاکہ اس کے ماں باپ کی عزت محفوظ رہے اور یہ کہ انہیں حوالات میں بند نہیں کیا جائے گا اور عزت سے رکھا جائے گا۔ مسلمان مطمئن ہو گئے۔ سکھ نے بذریعہ فون مجھے اطلاع دی۔ میں نے اُسے بتایا کہ دونوں میرے ملزم ہیں۔ ہار اور رقم کی چوری کی رپورٹ میرے پاس درج ہے اور لڑکی کی گمشدگی کی بھی رپورٹ ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میرا اے۔ ایس۔ آئی آ رہا ہے، دونوں کو اس کے حوالے کر دے۔

رشوت، رقم بھی، عورت بھی

میں نے خُدا کا شکر ادا کیا، یہ اس کی ذاتِ باری کی خاص کرم نوازی تھی کہ میرا کام گھر بیٹھے ہو گیا تھا۔ میں لڑائی والے کیس کی کارروائی میں اُلجھ گیا۔ رات کا ایک بج گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی دو تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ مجھے بہت زیادہ تھکن ہونی چاہیئے تھی لیکن ڈسپنسر کی بیٹی، ہار اور رقم کی برآمدگی نے تر و تازہ کر دیا۔ ویسے بھی وہ جوانی کا دَور تھا۔ جسم حیران کن حد تک کام کر سکتا تھا۔ میں تفتیش کے کمرے میں چلا گیا جہاں جناب مولانا بند تھے۔ یہ شخص مسلمانوں

کے گھروں کے پکے ہُوئے مرغن کھانوں، حلوے اور کھیر کا عادی تھا۔ اس کی قابلِ رشک صحت کا راز بھی یہی تھا۔ میرے پاس اُس نے جتنے وقت روٹی کھائی میں نے اُسے ایک بھی وقت گوشت نہیں دیا، تنور سے تڑکے کے بغیر دال منگوا کر اسے کھلاتا رہا۔ میں نے یہ اہتمام خاص طور پر کیا تھا تاکہ وہ اپنی اصلی جگہ آ جائے۔

اس جگہ وہ آ گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہارے ہُوئے آواز میں بولا "میرے ساتھ آپ کیا سلوک کریں گے؟"

"وہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں" — میں نے مہاراجہ پورس کے وہ الفاظ دہرائے جو اُس نے سکندرِ اعظم سے کہے تھے۔

"تم اب میرے چکر سے نکل نہیں سکتے" — میں نے اُسے کہا — "بیان دو یا نہ دو۔ میرے پاس شہادت آ گئی ہے کہ لڑکے کو تم نے اس کام کے چار آنے دیئے تھے کہ وہ اس عورت کی پرچی پر لوٹا گھما دے۔ میرے پاس اس کی بھی شہادت آ گئی ہے کہ تم اس عورت کو پھانسنا چاہتے تھے اور اسے ڈسپنسر نے نہیں تم نے لوٹے کے عمل کے لیے بُلایا تھا۔ کہو تو تمہارے جرم کی پوری کہانی بمع ثبوت اور شہادت سنا دوں۔ اگر تم نے خود یہ کہانی سُنا دی تو میں تمہارا کچھ خیال کروں گا۔ اگر مجھے چکر دینے کی کوشش کرو گے تو اس عورت کے خاوند کو قتل کرنے کی کوشش میں تمہیں کم از کم دس سال کے لیے جیل بھجواؤں گا۔"

"وہ مر تو نہیں گیا؟" — اُس نے پوچھا۔

"تم اپنی رام کہانی سناؤ" — میں نے کہا — "ہیرا پھیری نہیں چلے گی"۔
اُس نے رشوت پیش کی۔ میرے پاؤں پکڑے۔ رشوت کا بھاؤ چڑھا۔ میں خاموشی سے اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"مجھے میرے گھر لے چلیں" — اُس نے کہا — "وہاں جتنی رقم ہے لے لیں۔ رقم تھوڑی نہیں"۔

میں خاموش رہا۔

اُس نے رازداری سے کہا — "میرے محلے کی کسی عورت کا نام لیں۔ آپ کے پاس لے آؤں گا"۔

میں خاموش رہا لیکن میرے اندر ایک بگولہ اُٹھ رہا تھا۔

اُس نے کہا — "ڈسپنسر کی بڑی بیٹی لادوں؟ خدا کی قسم ایسی لڑکی کبھی آپ نے خواب میں نہیں دیکھی ہوگی"۔

میرے ارادے اور کوشش کے بغیر میرا دایاں بازو لاٹھی کی طرح اُٹھا اور میرا ہاتھ اس قدر زور سے اُس کے منہ پر پڑا کہ وہ گھوما، چکرایا اور مجھ سے تین چار قدم دُور گرا۔ وہ اُٹھا تو میں نے اُس کے پہلو میں گھونسہ مارا۔ وہ اس پہلو پر جُھکا اور گر پڑا۔ خُدا نے مجھے بازو لمبے عطا کیے ہیں اور اُس دور میں میرے ہاتھ میں محمد علی باکسر جیسی طاقت تھی۔ وہ اُٹھ نہ سکا۔ میں نے اُس کی ایک کلائی پکڑ کر بازو مروڑا اور اُسے اُٹھایا۔ وہ ادھ مُوا ہو گیا تھا۔

یہ شخص پہلے روز میرے سامنے آیا تھا تو اس نے مجھ پر اپنی غیبی قوت کا رُعب جمانے کی کوشش کی تھی مگر گنہگار کی ایکٹنگ زیادہ دیر

تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

خُدا کے گھر میں

اُس کا دماغ بالکل اُسی جگہ آ گیا جہاں میں لانا چاہتا تھا۔ اُس نے پانی مانگا۔ میں نے اُسے پانی پلایا اور کہا کہ اپنی اصلیت بتائے اور اپنے گناہوں کی پوری روئیداد سنائے۔

اُس کا بیان بہت طویل تھا۔ آپ کی دلچسپی کی باتیں یہ ہیں کہ وہ انبالہ میں اپنے جیسے ایک مولوی کا شاگرد تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ وہ سوتیلی ماں کے بُرے سلوک سے جالندھر سے بھاگا تھا۔ انبالہ کی اس مسجد میں اُس نے پناہ لی تھی۔ امام کو اُس نے بتایا کہ وہ کیوں بھاگا ہے اور اب وہ واپس نہیں جانا چاہتا۔ امام نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس سے خدمت کراتا رہا اور اسے یہی "علم و ہنر" سکھاتا رہا جس کا کمال اُس نے بار اور نقدی کی چوری کے سلسلے میں دکھایا تھا۔ امام نے اُسے یہ بھی سکھایا کہ لوگوں پر جذباتیت اور اپنا تقدس کس طرح طاری کیا جاتا ہے۔ قرآن کی چند ایک آیات بھی اُسے یاد کرادیں اور ایسے وعظ سکھا دیئے جن کا کوئی موضوع نہیں ہوتا لیکن سامعین پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ شخص بغیر علم کے عالم اور مذہب سے بیگانہ رہ کر مذہبی پیشوا بن گیا۔ اُستاد نے اسے کتاب سے فال نکالنے، غیب کا حال بتانے، ٹونا گھانے اور خواتین کو جذباتیت کے جال میں پھانس کر عیش و عشرت کرنے

کے طریقے بتا دیئے۔

"مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کوئی مشکل نہیں" — اُس نے کہا — "مسلمان مذہب کے نام پر مرمٹتا ہے۔ اگر ہماری قوم مذہب سے واقف ہوجائے تو ہمارے ہاتھ کی صفائی اور زبان کا جادو ختم ہوجائے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مریدوں کے دلوں میں مذہب نہیں بلکہ مذہب کا تقدس قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مولوی لوگ تعلیم یافتہ لوگوں کے خلاف باتیں کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو تعلیم نے گمراہ کردیا ہے۔ ہماری کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جائے، ہمارے پاس آئے، پیسے دے، دعا کرائے اور تعویذ لے۔"

اُس نے امامت کے ایسے ایسے راز فاش کیے جو میں بیان کردوں تو مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ یہ شخص جب جوان ہوگیا اور آزادی سے کاروبار چلانے کے قابل ہوگیا تو اپنے اُستاد کے ٹرنک سے پانچ چھ سو روپیہ چوری کرکے غائب ہوگیا۔ تین چار جگہوں پر رہا۔ آخر میرے قصبے کی اس مسجد میں آگیا۔ اسے شاید پتہ چل گیا تھا کہ اس مسجد کا امام مرگیا ہے۔ اسے مسجد دے دی گئی۔ مسلمان برِصغیر کے کسی بھی گوشے کا ہو اُس میں اپنی قوم کی ہر ایک خامی اور کمزوری ہوتی ہے۔ اس قصبے میں اسے ویسے ہی مسلمان ملے جیسے انبالہ میں تھے۔ اس نے مذہب کو پوری کامیابی سے کاروبار بنایا اور وہ عامل بھی کہلانے لگا عالم بھی۔ اس کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ عامل تھا نہ عالم۔ اس کی کامیابی کی وجہ وہی تھی جو اسے استاد نے بتائی تھی۔ یعنی لوگوں کی جذباتیت

اور اندھی عقیدت مندی۔ اس نے بتایا کہ عورت میں یہ کمزوری زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی قباحت کی بدولت عورتیں اس کے جال میں اُلجھی رہتی تھیں۔

اس کے اقبالِ جرم کے مطابق ڈسپنسر کی بڑی بیٹی بھی اُس کے طلسم سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ ڈسپنسر اس کا اندھا مرید تھا۔ صرف یہ ایک عورت تھی (جس پر اُس نے چوری کا الزام لگایا تھا) جو اس کی اصلیت بھانپ گئی تھی۔ اس شخص نے اس عورت کے متعلق وہی بیان دیا جو اس عورت اور اس کے خاوند کی زبانی آپ کو سُنا چکا ہوں۔

ایک روز ڈسپنسر نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی نے ٹرنک کھولا تو اسے پتہ چلا کہ سونے کا ایک ہار اور تین سو روپے غائب ہیں۔

مولوی نے فوراً کہا — "لوٹا چور کو پکڑ لے گا" — اُس نے کوئی اداکاری کی اور ڈسپنسر کو لوٹا گھمانے کا دن اور وقت بتایا۔

اُس نے بیان میں کہا کہ اُس نے اس عورت کو پھانسنے کی ترکیب سوچ لی۔ اُسے جھانسے دیئے، دھمکیاں بھی دیں۔ آخر اسے مشتبہ افراد میں شامل کرلیا۔ لوٹا گھمانے والے لڑکے کو اُس نے چار آنے دے کر مشق کرائی کہ وہ کس طرح لوٹا گھمائے گا۔ آج چار آنے کچھ بھی نہیں سمجھے جاتے، اُس زمانے میں چار آنے میں ایک کُنبے کی ہانڈی پک جایا کرتی تھی۔ لڑکے نے اس کا یہ فریب کامیاب کردیا۔ عورت کا ردِعمل وہی تھا جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ اس شخص نے عورت سے کئی بار کہا کہ وہ اس کے پاس آجائے الزام صاف کردیا جائے گا مگر عورت کردار کی بہت پکی ثابت ہوئی۔ مولوی نے اس کے خاوند کو بھی

بھانسنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔

اس دوران وہ ڈسپنسر کو بھڑکاتا رہا۔ دو تین بار ڈسپنسر نے اسے کہا کہ بے شک لوٹا اسی عورت کے نام پر گھوما ہے لیکن غور کیا جائے تو ممکن نظر نہیں آتا کہ اس عورت نے چوری کی ہوگی۔ اُس نے مولوی کو بتایا کہ زیورات والے ٹرنک کہاں پڑے تھے مگر اس شخص نے اقبالی بیان میں کہا کہ اس نے ڈسپنسر سے کہا کہ لوٹا میں نے نہیں قرآن کی آیات نے گھمایا ہے۔ قرآن کے احکام پر شک کرنا گناہ ہے اور یہ عورت اور اس کا خاوند چوری کے گناہ کے علاوہ قرآنی آیات کی نافرمانی کا گناہ بھی کر رہے ہیں۔

اس نے ڈسپنسر کو قرآن اور اسلام کے نام پر ایسا بھڑکایا کہ اُسے اپنے اُوپر قابو نہ رہا۔ اس شخص نے یہ بھی کہا کہ اس عورت کو اور اس کے خاوند کو اگر چوری کی سزا نہ مل سکے تو انہیں قرآنی آیات کی نافرمانی کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ جو کوئی قرآنی آیات کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے اسے سزا دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ڈسپنسر چونکہ جنونی مذہب پرست تھا اس لیے اُس نے اپنا فرض ادا کر کے ثوابِ دارین حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس عورت کے خاوند کو دوائی دی تو اس میں زہریلی دوائی کی آمیزش کر دی۔

پردہ نشین لڑکی نے پردے چاک کیے

اُس نے میری مرضی کے مطابق بیان دے دیا۔ میں نے اُسے دودھ

پلایا، پھر چارپائی اور بستر منگوا کر اُسے اسی کمرے میں سُلا دیا۔ اس سے پہلے وہ فرش پر سوتا تھا۔ سحر کا وقت تھا۔ میں بھی ذرا آرام کے لیے چلا گیا۔

آٹھ نو بجے میں اپنے دفتر میں آیا اور اس کے لیے نہایت اچھا ناشتہ منگوایا۔ اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اسے حوالات میں بند نہ کیا۔ اپنے دفتر میں لے آیا۔ اُس کی اُسی طرح عزت کی جس کا وہ عادی تھا۔ اسے بذریعہ لاری (بس) دوسرے شہر میں مجسٹریٹ کے پاس بیان قلمبند کرانے کے لیے لے جانا تھا۔ میں اسے ہتھکڑی لگانے لگا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اسے انہی لوگوں میں سے گزار کر لاری اڈے تک لے جانا تھا جو اسے جُھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ہتھکڑی نہ لگاؤں۔ میری ضرورت یہ تھی کہ وہ مجسٹریٹ کو میری مرضی کے مطابق بیان دے دے۔ میں نے اسے کہا کہ ہتھکڑی نہ لگانا جرم ہے لیکن میں اس کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے یہ جرم کر گزروں گا اور اگر اُس نے مجسٹریٹ کو بیان دیتے کوئی گڑبڑ کی تو میں اسے اس عورت کے خاوند کے قتل کے جرم میں سزائے موت دلا دوں گا۔

"کیا وہ مر گیا ہے"؟ — اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" — میں نے جواب دیا — "وہ مر گیا ہے"۔

اُسے مجسٹریٹ کے پاس لے گیا۔ اس نے بھی ڈسپنسر کی طرح میری مرضی کے مطابق بیان قلمبند کرا دیا۔ اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ میں واپس آیا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی ڈسپنسر کی بیٹی

کو اور اُس نوجوان کو لے آیا تھا۔ میں نے آپ کو پہلے یہ نہیں بتایا کہ ان کی شناخت کے لیے نوجوان کے باپ اور لڑکی کے بڑے بھائی کو اے۔ ایس۔ آئی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ دونوں تھانے میں بیٹھے تھے۔ لڑکی رو رہی تھی۔ بخدا مجھے بھی رونا آگیا۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ میرے دفتر میں بنچ پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ اُسے بھگا لے جانے والا اُس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ شاید اپنے آپ کو چالاک اور ہوشیار سمجھتا تھا۔ میرا ہاتھ لڑکی کے سر پر تھا۔ وہ اُٹھا اور بڑی پختہ آواز میں بولا — "دیکھو صاحب! میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہُوں کہ میں نے اسے اغوا نہیں کیا تھا، یہ خود میرے ساتھ گئی تھی۔"

میں نے پوری طاقت سے ویسا ہی تھپڑ اُس کے منہ پر مارا جیسا مولوی کو مارا تھا۔ مولوی تو جسم جثے والا تھا، مجھ سے تین چار قدم دُور گرا تھا، یہ نوجوان چھ سات قدم دُور دیوار سے جا لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل اندر آگیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اسے پچھلے کمرے میں جا کر بند کر دو۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے لے گیا تو میں نے لڑکی کے بھائی کو اندر بلا کر کہا کہ اپنی بہن سے کہو کہ مجھے تھانیدار نہ سمجھے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارا باپ بن کر دکھاؤں گا۔

بھائی نے بہن کو سمجھا دیا۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر ہار نکالا۔ بھائی نے ہار پہچان لیا۔ میں نے اُسے باہر بھیج دیا۔ لڑکی کو اپنے قریب بٹھا کر اُس کے دل سے پولیس اور اس کے جرم کی دہشت نکالنے کی کوشش کی۔ اس کیفیت میں مجرم تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ یہ تو پردہ نشین لڑکی تھی۔ اس نے میری شفقت قبول کر لی۔ اس نے میرے کہنے پر برقعے کا نقاب

اُٹھا دیا۔

"میں جو پوچھوں مجھے بالکل صحیح بتا دینا تاکہ میں تمہیں بچا سکوں" — میں نے کہا — "میں تمہیں گرفتار نہیں کرنا چاہتا، تمہیں گھر بھیجنا چاہتا ہوں .... ہار اور روپے تم نے ٹرنک سے نکالے تھے؟"

"جی!" — اُس نے کچھ سر ہلایا کچھ سرگوشی کی۔ یہ چوری اسی نے کی تھی۔

مجھے پہلے روز ہی شک ہو گیا تھا کہ چور اسی گھر میں موجود ہے۔ مجھے شک اس لڑکی کے بڑے بھائی پر تھا۔ آگے چل کر لڑکی پر بھی شک ہُوا تھا لیکن میری توجہ بڑے بھائی پر تھی۔ میں نے اسی شک کی بنا پر ڈسپنسر سے کہا تھا کہ میں چور پکڑ دوں گا لیکن رپورٹ درج نہیں کروں گا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ ایک مسلمان گھرانہ بدنام نہ ہو۔ اندر ہی اندر معاملہ دب جائے۔ اس بدبخت نوسرباز مولوی نے ایسے حالات پیدا کر رکھے تھے کہ ڈسپنسر میری بات سمجھ نہ سکا۔ اب اس گھر کی ایک لڑکی چوری کا اعتراف کر رہی تھی۔ میں اسے بچانا چاہتا تھا۔

میری حوصلہ افزائی اور مشفقانہ سلوک کے زیرِ اثر اس نے اپنا سینہ میرے آگے کھول دیا۔ میں ہمدردی کا اظہار کرتا گیا اور وہ بولتی گئی۔ مختصر یہ کہ وہ باپ کے سلوک اور اتنی کڑی پابندیوں سے تنگ آگئی تھی۔ ان کے گھر میں کبھی کوئی ہنسا اور مسکرایا نہیں تھا۔ باپ صرف ڈانٹتا ہی نہیں تھا بلکہ دونوں بیٹیوں پر شک کرتا رہتا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز میں طنز ہوتی تھی۔ کوٹھے پر بیت الخلا میں دیر لگ جائے تو باپ پوچھتا تھا کیوں دیر لگی۔ یہ الفاظ اس کی زبان پر رہتے تھے — "اُوپر جا کر کسے دیکھتی رہی ہو" —

نماز اس انداز سے پڑھنے کو کہتا تھا کہ بہن بھائیوں کے دل میں سے نماز کی پسندیدگی ختم ہو گئی تھی۔ وہ نماز خدا کے حکم سے نہیں باپ کے حکم سے پڑھتے تھے۔

اس لڑکی نے بتایا کہ اس کے لیے اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک وقت وہ ہوتا تھا جب ان کا باپ ان کی ماں کو مارتا پیٹتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ماں کو مارنے لگتا تھا۔ مختصر یہ کہ گھر جہنم بنا ہوا تھا۔ لڑکے تو باہر گھوم پھر لیتے تھے، مصیبت لڑکیوں کے لیے تھی جو دروازے میں ذرا سا پردہ اٹھا کر ایک آدھ منٹ کے لیے کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس لڑکی نے بتایا کہ اس کی چھوٹی بہن تو پتھر بن گئی ہے جیسے وہ جوان ہوئی ہی نہیں اندر ہی اندر مر گئی مگر یہ بڑی لڑکی اپنے من کو نہ مار سکی۔ ایک طرف تو باپ انہیں باہر کی ہوا سے بھی بچائے پھرتا تھا دوسری طرف یہ عالم کہ اس مولوی جیسا مجرم انسان کھلے بندوں ان کے گھر آتا تھا۔ دو بار بڑی لڑکی مولوی کے ہاں گئی۔ مولوی نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا۔

پنچھی پنجرہ توڑ گیا

"اس شخص نے محبت کا اظہار کیا تو مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور یہ کتنی پُرلطف ہے"— اس لڑکی نے کہا— "اگر یہ محبت مجھے اپنے باپ سے مل جاتی تو میں خراب نہ ہوتی۔"

محبت کے اس پہلے ذائقے نے لڑکی کے اندر یہ احساس بیدار کر دیا کہ وہ پنجرے میں بند ہے۔ اس احساس نے اسے کوٹھے پر تانک جھانک کا عادی بنایا اور چند دنوں بعد اس کی نظریں اس نوجوان پر ٹھہر گئیں۔ آپ لڑکی کو آوارہ اور بدمعاش کہیں گے۔ انسانی نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی رائے کچھ اور ہے اور یہی رائے صحیح ہے۔ ان دونوں کے درمیان پہلے اشارے ہوتے رہے پھر اس نوجوان نے یہ دلیری کی کہ ایک رات کوٹھوں کے اُوپر اُوپر سے لڑکی کے کوٹھے پر آ گیا۔ اس سے پہلے یعنی دن کے وقت لڑکی کو لڑکے کا پیغام ملا تھا۔

پیغام لانے والی کون تھی؟— میری وہی مخبر عورت جس نے مجھے رپورٹ دی تھی کہ ڈسپنسر کی بڑی بیٹی ایک نوجوان سے چوری چھپے ملتی ہے۔ میں نے آپ کو اس قسم کی عورتوں کے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ یہ پیغام رسانی بھی کرتی ہیں، مخبری بھی کرتی ہیں۔ اس عورت نے بھی دونوں کام کیے۔ وہ اس فن کی ماہر تھی۔ لڑکی کی اس نوجوان کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے اسے محبت بھی دی اور جذباتی سہارا بھی دیا۔ اس کے بعد اس کی حوصلہ افزائی یہ مخبر عورت کرتی رہی۔ کوٹھے پر رات کے وقت بہت ہی مختصر تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار باپ نے پکڑ لیا اور اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔

لڑکی کو باہر کا سہارا مل گیا تھا۔ اُس نے اس عورت کی وساطت سے نوجوان کو اُوپر بلایا۔ اُس روز ڈسپنسر اپنی بیوی کے ساتھ کسی رشتہ دار کی شادی پر چلا گیا تھا۔ دن کو لڑکی کے دونوں بھائی گھر سے چلے گئے۔ اس کی

چھوٹی بہن کو آزادی ملی تو بڑی بہن نے اُسے پڑوسیوں کے گھر بھیج دیا۔ اُس نے باہر کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹرنکوں والے کمرے میں جا کر زیورات والے ٹرنک کے اُوپر سے دونوں سوٹ کیس اور ایک ٹرنک اتارا۔ نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا اور ہار اور رقم نکال کر چھپا دی۔ اس نے صرف ہار اس لیے نکالا تھا کہ یہ زیادہ قیمتی تھا۔ اسے بیچنے کا ارادہ تھا۔ اس نے ٹرنک اسی طرح رکھ دیئے جس طرح رکھے رہتے تھے۔

رات کوٹھے پر وہ نوجوان آ گیا۔ لڑکی نے اُسے ہار اور رقم دے کر کہا کہ وہ اُس کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے اور یہ ہار اور رقم اسی مقصد کے لیے ہے۔ وہ ہار اور رقم لے گیا۔ لڑکی کو لڑکے کے پیغام کا انتظار آٹھ دس روز کرنا پڑا۔ ایک روز چوری کا انکشاف ہو گیا —— اور جب ڈسپنسر گرفتار ہو گیا تو نوجوان کا پیغام ملا۔ لڑکی رات کو نکل گئی۔ لڑکا باہر انتظار میں تھا۔ وہ رات کی گاڑی سے نکل گئے۔ لڑکا اسے اپنے دوست کے گھر لے گیا تھا مگر دوسری رات یہاں (قصبے) سے اس دوست کے گھر کا ایک آدمی وہاں پہنچا اور اسے بتایا کہ پولیس نے اُس کا ایڈریس پوچھا ہے، اگر تمہارا دوست تمہارے گھر ہے تو اُسے فوراً گھر سے نکال دو۔ دوست نے ان دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ دوست کی بیوی پہلے ہی انہیں گھر میں رکھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

دونوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کچھ رقم لڑکا بھی گھر سے لے گیا تھا۔ وہ بیکار گھومتے پھرتے رہے۔ رات کی گاڑی سے

انہوں نے دِلّی جانے کا فیصلہ کیا لیکن وہ جذبات کے زیرِ اثر گھروں سے بھاگے تھے۔ اس نوجوان نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ گھبراہٹ میں لڑکی کو ساتھ لیے آوارہ پھرتا رہا اور دونوں پکڑے گئے۔

نوجوان کا تفتیش کے خصوصی کمرے میں بیان لیا۔ اُس نے لڑکی کے بیان کی تصدیق کی۔ میں لڑکی کو مزید ذِلّت سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر مجھے لڑکے کو بھی چھوڑ دینا تھا۔ میں نے لڑکی کے بھائی کو اور لڑکے کے باپ کو اندر بلایا اور ایسی کارروائی شروع کر دی جس کا تھانیداری کے فرائض کے ساتھ دور پار کا بھی تعلق نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دے۔ اگر اس نے ہیرا پھیری کی تو میں اس کے بیٹے کو چوری اور اغوا میں آٹھ دس سال کے لیے اندر کرا دوں گا۔

باپ مان گیا۔ لڑکا پہلے ہی رضامند تھا۔ اُس کے باپ کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ اُسے کم از کم پانچ سال سزا ضرور ملے گی۔ میں اس کفرستان میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے مسلمانوں کی عزّت اور وقار کا بہت خیال رکھتا تھا مگر بعض مسلمانوں کو اپنے وقار کا کوئی خیال نہیں تھا۔

میں نے ہار اور رقم کی چوری کا کیس دبا لیا۔ لڑکی اور لڑکے کو گھر بھیج دیا۔

ڈسپنسر اور اُس کے مُرشد نوسرباز کے کیس کا فیصلہ چار ماہ بعد ہُوا۔ میں نے کیس بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ ڈسپنسر کو چھ سال اور مولوی کو دو سال سزائے قید ہُوئی۔ ان کی اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔

اس کے فوراً بعد ڈسپنسر کی بیٹی کی شادی اس نوجوان کے ساتھ کر دی گئی۔

○○○

جذبات کے جنگل میں

تھانیدار جو میرے پڑوس کے تھانے کا انچارج تھا، ایک تفتیش کے دوران لاپتہ ہوگیا۔ کہا جاسکتا تھا کہ وہ قتل کی جس واردات کی تفتیش کر رہا تھا اس کے گمنام ملزموں نے اسے اغوا کر کے کہیں قتل کر دیا اور لاش غائب کر دی ہے یا اُس سے اپنی شرائط منوانے کے لیے اُسے صرف اغوا کیا ہے۔

مجھے اپنے بالائی حکام سے حکم ملا کہ میں اس تھانے میں چلا جاؤں اور گمشدہ تھانیدار کی تلاش کروں اور ملزموں کو گرفتار کر کے ان کو سزا دلواؤں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کام کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر سے کوئی اور سب انسپکٹر بھیجا جاتا لیکن انگریز بادشاہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی خوش تھے جس کی سزا مجھے اس قسم کی فالتو ڈیوٹیوں کی صورت میں ملا کرتی تھی۔

تھانیدار کا اغوا بڑی سنگین واردات تھی۔ سنگین کے علاوہ مجھے اس واردات کا یہ پہلو پریشان کر رہا تھا کہ جن ملزموں نے ایک تھانیدار کو اغوا کر لیا ہے وہ کوئی اناڑی لوگ نہیں پختہ کار جرائم پیشہ ہوں گے۔ میں

اس علاقے سے واقف تھا۔ چٹانی اور جنگلاتی علاقہ تھا۔ وہاں استاد رہزن اور ڈکیت بھی تھے۔ ڈکیتی کی منظم وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ اگر تھانیدار اغوا ہی ہُوا تھا تو یہ کسی منظم گروہ کی واردات معلوم ہوتی تھی۔

اس تھانیدار کو میں جانتا تھا۔ دلیر اور رنگین مزاج تھا اور کبھی کبھی احمقانہ حرکتیں بھی کیا کرتا تھا۔ کسی کی مانتا اور سُنتا نہیں تھا۔ اپنی کرتا تھا۔ مجھے اس امکان کا بھی شُبہ ہُوا کہ خود ہی کہیں چلا گیا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ بھگوڑا ہوگیا ہو۔ ایسی حرکت بعید از قیاس نہیں تھی۔ وہ آدمی کچھ ایسا ہی تھا۔ اُس کی عمر ابھی تیس سال نہیں ہُوئی تھی۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا اور ذہنی لحاظ سے نابالغ۔ خُوبرو تھا اور جسم کی ساخت سے باکسر لگتا تھا۔ رنگ روپ صاف سُتھرا تھا اور وہ خوش طبع بھی تھا۔

میں حکم ملتے ہی روانہ ہوگیا۔ وہ قصبہ بارہ میل دُور تھا۔ علاقے کی تجارت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اردگرد کے دیہاتی علاقے میں بھی ہندو اکثریت میں تھے۔ دولت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔

متعلقہ تھانے میں ایک ہندو اسے ایس آئی (اسسٹنٹ سب انسپکٹر) نے میرا استقبال کیا۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ تھانیدار کی گمشدگی کی جو کہانی مجھے سنائی گئی وہ اختصار سے یوں تھی کہ سات آٹھ دن گزرے ایک ہندو ساہوکار دیہاتی علاقے میں اپنے مقروضوں سے وصولیاں کرنے گیا۔ اس کام کے لیے ہر ماہ اُس کا مُنشی یا

بیٹا جایا کرتا تھا۔ اگر کوئی مقروض پریشان کرے تو وہ خود جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندو ساہوکار سُود پر قرضے دیتے ہیں۔ سُود اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والا سُود ہی ادا کرتا رہتا ہے اور اصل رقم جُوں کی تُوں سر پر موجود رہتی ہے۔

یہ ہندو ٹٹو پر سوار ہو کر صبح سویرے ایک گاؤں کو روانہ ہُوا جو قصبے سے سات آٹھ میل دُور تھا۔ علاقہ چٹانی تھا اور جنگل کی طرح درخت بہت تھے۔ رہزنی کے لیے علاقہ موزوں تھا۔ شام تک ساہوکار واپس نہ آیا تو گھر والوں نے سمجھا کہ دوسرے مقروضوں کے ہاں بھی چلا گیا ہوگا۔ رات آدھی ہونے کو آئی۔ ساہوکار نہ آیا تو فکر پیدا ہُوا۔ ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا کہ کسی مقروض نے اُسے یا اُس کے بیٹوں کو رات کے لیے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا ہو۔ ساہوکار کے سُسرال دیہاتی علاقے میں تھے۔ شاید وہاں چلا گیا ہو گا لیکن وہ اپنی بیوی کو بتا کر نہیں گیا تھا کہ وہ اُس گاؤں بھی جائے گا۔

دوسرے دن دس گیارہ بجے تک ساہوکار نہ آیا تو اس کے بڑے بیٹے نے اپنے منشی کو ساتھ لیا۔ دونوں ٹٹوؤں پر سوار ہو کر اُس گاؤں گئے جہاں ساہوکار گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ دوپہر کے وقت واپس چلا گیا تھا۔ بیٹا اپنے باپ کے سسرال کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ ساہوکار وہاں گیا ہی نہیں۔ بیٹا واپس چل پڑا۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی کہ ساہوکار قتل یا اغوا ہو گیا ہے۔

ایسی واردات کوئی عجوبہ نہیں تھی۔

واپسی پر، قصبے سے کوئی تین ساڑھے تین میل دُور، ایک آدمی ایک ٹیکری پر کھڑا دیکھا۔ بیٹا اور منشی قریب سے گزرے تو اس آدمی نے کہا ــــ "کیسا کلجگ ہے۔ گدھ ایک لاش کو کھا رہے ہیں۔ اسے کسی نے قتل کیا ہو گا۔"

ساہوکار کا بیٹا ٹیکری پر گیا تو کچھ دُور اُسے پانچ سات آدمی نظر آئے۔ وہ ایک جگہ اکٹھے کھڑے تھے۔ درختوں پر اور قریب کی چٹان پر بہت سے گدھ بیٹھے تھے۔ یہ آدمی جو ٹیکری پر کھڑا تھا لاش دیکھ آیا تھا بلکہ بھاگ آیا تھا۔ ساہوکار کے بیٹے کے پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ لاش کسی دیہاتی کی نہیں شہری کی معلوم ہوتی ہے۔ ساہوکار کا بیٹا آگے چلا گیا۔ لاش کے قریب گیا تو اُسے شناخت میں ایک سانس جتنی بھی دیر نہ لگی۔ یہ اُس کے باپ کی لاش تھی۔ اتفاق سے چہرہ محفوظ تھا۔ گِدّھوں نے پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں وغیرہ کھا لی تھیں۔ باقی جسم پر کہیں کہیں گوشت رہ گیا تھا۔ پسلیاں ننگی ہو گئی تھیں۔ ساہوکار کے بیٹے نے لاش کے پاس کھڑے آدمیوں کو بتایا کہ یہ اُس کے باپ کی لاش ہے اور وہ تھانے جا رہا ہے، اتنی دیر وہ وہیں کھڑے رہیں۔

بیٹا منشی کو ساتھ لیے قصبے کو گیا اور تھانے میں رپورٹ دی۔ یہ مسلمان تھانیدار جو بعد میں لاپتہ ہو گیا تھا جائے واردات پر گیا۔ اس نے لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا اور مقتول ساہوکار کے بیٹے کے

بیان پر اُس گاؤں گیا جہاں ساہوکار وصولی کے لیے گیا تھا۔ اُسے شک تھا کہ قتل میں اس مقروض کا ہاتھ ہوگا۔

گاؤں کے کئی لوگوں نے بتایا کہ ساہوکار گاؤں سے چلا گیا تھا اور اُس کا یہ مقروض گاؤں سے نہیں نکلا تھا۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ کسی مقروض نے تنگ آکر اپنے ساہوکار کو قتل کر دیا ہے۔ کسی ساہوکار سے قرض لے کر اس سے گلو خلاصی کرانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ اَن پڑھ مقروض تو زیادہ پریشان رہتے تھے کیونکہ وہ حساب سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور ساہوکار انہیں اپنے ظالمانہ جال میں پھانسے رکھتے تھے۔ اگر کسی مقروض کی بہو یا بیٹی جوان ہو تو اُس پر دست درازی تک کرتے اور قرض میں یعنی سُود میں تھوڑی سی چھوٹ دے دیتے تھے۔ غریب لوگ اس بے عزتی کو بھی برداشت کرتے تھے۔

سوتیلی ماں، جوان بیٹا

تھانیدار ساہوکار کے اس مقروض کو تھانے لے گیا۔ اُس نے اس علاقے کے دوسرے مقروضوں کو بھی تھانے بلا لیا۔ ان کی تعداد تین یا چار تھی۔ ساہوکار کے بیٹے اور مُنشی سے پوچھا گیا کہ ان میں کس کے حساب میں کتنا قرض تھا اور ان میں سے کون ماہوار ادائیگی میں پس و پیش کرتا تھا۔ تھانیدار کو بتایا گیا کہ کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی اور کسی

نے کبھی دھمکی نہیں دی بلکہ ذرا سی بدسلوکی بھی نہیں کی تھی۔ تھانیدار نے اپنے طریقے سے تفتیش اور پوچھ گچھ کی۔ لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم میں جو اندرونی اعضاء مثلاً معدہ، تلی، دل اور جگر وغیرہ دیکھے جاتے ہیں، وہ گِدّھوں نے کھا لیے تھے۔ چہرے اور سر کے سوا جسم کا کوئی حصّہ محفوظ نہ تھا جس سے پتہ چلتا کہ اسے کون سے ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ اگلی صبح تھانیدار مقتول کے گھر گیا۔ گھر میں اُس نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ یہ انیس بیس سال کی عمر کی بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی جو مقتول ساہوکار کی بیٹی نہیں، اس کی دوسری بیوی تھی۔ مقتول کی عمر پچاس سال سے کچھ ہی کم تھی۔ عمر کی زیادتی کے علاوہ مقتول کے متعلق بتایا گیا کہ بھدّے اور پھُولے ہُوئے جسم کا ٹھنگنا سا آدمی تھا اور بدصُورت بھی۔ ہندو بنئے قدرتی طور پر مکروہ صورت ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں تو بہت ہی مکروہ ہوتی ہیں۔ اس مقتول ساہوکار کے متعلق بتایا گیا کہ اس کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔ چھ ہی ماہ بعد اس نے اپنے ایک مقروض کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شادی واردات سے چھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔

اسی گھر میں جہاں اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی تھی وہاں ساہوکار کے دو بیٹے بھی تھے۔ ایک اس لڑکی سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا اور دوسرا ڈیڑھ دو سال چھوٹا۔ جوان سوتیلی ماں، اس کا جوان سوتیلا بیٹا اور اس بیٹے کا بوڑھا اور بھدّا باپ قتل یا خودکشی یا اغوا کی واردات کا ایک تیر بہدف نسخہ ہوتا

ہے۔ اگر بوڑھا قتل ہو جائے تو پولیس سب سے پہلے اُس کی جوان بیوی اور جوان بیٹے پر ہاتھ رکھتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیٹا بے گناہ ہو تو اُس کی سوتیلی ماں بے گناہ نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے۔

جس علاقے کی میں بات کر رہا ہوں وہاں ہندو ساہوکاروں اور آڑھتیوں کے ہاں یہ رواج بھی تھا کہ ان کے منشی مسلمان ہوتے تھے جن میں حساب کتاب رکھنے کی سوجھ بوجھ کے علاوہ غنڈہ گردی کا وصف بھی ہوتا تھا۔ اگر منشی ہندو ہو تو ان کے ہاں ایک دو ملازم مسلمان ہوتے تھے جو گلے پڑ جانے اور بیہودگی پر اُتر آنے کی مہارت رکھتے تھے۔ اس قسم کے منشیوں اور ملازموں کا استعمال یہ ہوتا تھا کہ کسی کے پاس رقم پھنس جائے تو وہ نکلوا لاتے تھے۔

میں آپ کو ایک کہانی سنا چکا ہوں جس میں ایک مسلمان منشی ایک ہندو آڑھتی کی جوان بیوی سے منسلک تھا اور ایک بھیانک واردات کا باعث بنا تھا۔ اب جو واردات میرے سامنے آئی اس میں بھی منشی مسلمان تھا۔ مجھے اس منشی کی چھان بین کرنی تھی۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ لاپتہ ہو جانے والے تھانیدار نے اس منشی کو شاملِ تفتیش کیا تھا یا نہیں۔ میں ابھی معلوم کر رہا تھا کہ تفتیش میں کیا کچھ سامنے آیا ہے۔ واردات کو آٹھ روز گزر گئے تھے اور تفتیش کرنے والا لاپتہ تھا۔ اس کے لاپتہ ہو جانے سے یہ فرق نہیں پڑتا تھا کہ تھانے میں کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کون سی لائن پر تفتیش کر رہا تھا اور اتنے دن وہ کس نتیجے پر پہنچا تھا۔

تھانیدار جب تفتیش کے لیے جاتا ہے تو اُس کا سٹاف اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل پوری طرح ساتھ ہوتا ہے۔ اے ایس آئی ساتھ نہیں ہوتا لیکن وہ تھانہ انچارج کا دستِ راست ہوتا ہے تھانیدار اُسے اپنی کارگزاری بتاتا رہتا ہے مشورے بھی لیتا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ تھانیدار اور اس کا اسسٹنٹ واردات کے متعلق آپس میں باتیں کرتے ہیں اگر ان میں سے کوئی رشوت لے تو وہ دوسرے سے چھپاتا نہیں۔ حصّہ بانٹتے ہیں۔

لڑکی کی خوبصورتی، عجیب و غریب، پُراسرار

اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کسی بھی تفتیش سے بے خبر رہ ہی نہیں سکتے۔ وہ مُخبروں کو استعمال کرتے اور ان سے رپورٹیں لیتے ہیں۔ تھانیدار کو بتاتے ہیں، مگر اس واردات میں مجھے یہ عجیب بات سنائی گئی کہ اس گمشدہ تھانیدار نے پہلے دو روز اے۔ ایس۔ آئی (یہ ہندو تھا) کو اور اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو تفتیش سے باخبر رکھا۔ اس کے بعد اُس نے انہیں بے خبر رکھنا شروع کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ واردات کے اگلے روز وہ مقتول کے گھر گیا۔ بہت دیر بعد واپس آیا۔ اُس کے ساتھ ایک ایسی خوبصورت لڑکی تھی جس کی خوبصورتی عجیب و غریب تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اے۔ ایس۔ آئی

نے اس لڑکی کی خوبصورتی کو "عجیب و غریب" کہا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل پاس بیٹھا تھا۔ اُس کی حالت ایسی تھی جیسے اُس پر مقتول کی دوسری بیوی کی خوبصورتی جادو کی طرح سوار ہوگئی ہو۔ دونوں نے جھوم جھوم کر نشے کی سی حالت میں مجھے بتایا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ تفتیش کی بات کو آگے بڑھا ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی کیفیت بالکل ایسی ہوگئی تھی جیسے ریکارڈ پر کہیں سوئی اٹک جاتی ہے تو ریکارڈ گانے کے انہی ایک دو لفظوں کو دُہراتا رہتا ہے جن کی لکیر میں سوئی اٹک جاتی ہے۔ میں نے انہیں اس کیفیت سے نکالا اور باقی بات سُنی۔

وہ اس لڑکی کی خوبصورتی کو عجیب و غریب کہنے میں حق بجانب تھے۔ اس علاقے میں خوبصورتی نایاب چیز تھی۔ شہروں میں کسی کا رنگ ذرا صاف سُتھرا نظر آجاتا تھا۔ مسلمانوں کے نقش و نگار قدرے اچھے تھے۔ ہندوؤں میں خوبصورتی نام کو نہیں تھی۔ دیہاتی علاقے میں تو گہرا سانولا رنگ ملتا تھا۔ کسی کے نقش اچھے ہوں تو اُسے خوبصورت کہہ لیا جاتا تھا یا کسی لڑکی کا رنگ گندمی ہو تو اُسے خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ اس لڑکی کے متعلق بتایا گیا کہ رنگ سفیدی مائل گندمی، جلد ملائم اور صاف، آنکھیں سبز اور شربتی کے ملے جُلے رنگ کی تھیں۔ بال گہرے بادامی اور قد بُت بہت اچھا۔

اس علاقے میں خوبصورتی کا یہ معیار واقعی عجیب و غریب تھا۔

میں اگر اسے پُراسرار کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ بعد میں جب میں نے اس لڑکی کے باپ کو اور اس کی ماں کو دیکھا تو میں اور زیادہ حیران ہُوا۔ ان دونوں کی بیٹی کو سفیدی مائل گندمی رنگ کا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ آنکھوں اور بالوں کا بھی یہ رنگ نہیں ہوسکتا تھا۔ لڑکی کی ایک بہن تھی اور ایک بھائی۔ دونوں کے رنگ گہرے سانولے اور اپنے ماں باپ کی شکل و صورت کے تھے اور اپنے علاقے کی صحیح تصویر تھے۔

میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں بھی لڑکی کی خوبصورتی میں پھنس گیا ہوں اور بات لمبی کر دی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس لڑکی کو تھانے میں لاکر تھانیدار نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو بتایا کہ اُسے اس لڑکی پر شک ہے کہ اس نے خاوند کو قتل کرایا ہے۔ اُس نے اس شک کا بھی اظہار کیا کہ قتل میں مقتول کے دونوں بیٹوں میں سے بھی ایک کا ہاتھ ہوسکتا ہے اور مُنشی بھی مُشتبہ ہے۔ تھانیدار مقتول کے دونوں بیٹوں اور منشی کو بھی تھانے لے آیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی کا خیال تھا کہ مقتول رہزنوں کا شکار ہُوا ہے۔ تھانیدار کہتا تھا کہ رہزن لُوٹا کرتے ہیں قتل نہیں کیا کرتے۔ ان کے ہاتھوں وہ لوگ قتل ہوتے ہیں جو اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس ہندو ساہوکار میں مقابلے کی ہمت کہاں تھی۔

تھانیدار نے رات کو لڑکی کو تفتیش کے کمرے میں رکھا۔ اُس رات اُس نے کسی اور مشتبہ کو تفتیش کے کمرے میں نہیں بلایا۔ اُس نے رات کے آخری پہر لڑکی کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ گھر بھیج دیا اور مقتول کے

دونوں بیٹوں اور منشی کو تھانے میں پابند رکھا۔ اُس نے اے ایس آئی کو بتایا کہ لڑکی سخت ہے اور عقل والی ہے۔ اُس نے ساری رات ہمت نہیں ہاری اور کوئی سراغ نہیں دیا۔ دن کے دوران اُس نے مقتول کے بیٹوں کو سامنے بٹھایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد انہیں گھر بھیج دیا اور منشی کو بلایا۔ اس کے ساتھ اُس نے زیادہ وقت صرف کیا۔ آخر اسے بھی گھر بھیج دیا۔

اس کے بعد اُس نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کو اپنی جو کارگزاری بتائی اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ رازداری سے کام لے رہا ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی کے پوچھنے پر بھی اُس نے اس طرح تفصیل سے جواب نہ دیا جس طرح ایک تھانیدار اپنے اسسٹنٹ کو دیا کرتا ہے۔

رات کو تھانیدار مقتول کے گھر چلا گیا۔ اپنے ساتھ وہ ایک بھی کانسٹیبل کو نہیں لے گیا اور وہ وردی میں بھی نہیں گیا۔ رات بہت دیر بعد واپس آیا۔ دوسرے دن اُس نے بتایا کہ لڑکی کے دل میں ایک راز ہے جو وہ تشدد سے نہیں نکال سکتا۔ وہ محبت اور پیار کا حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنی تفتیش پر پردہ ڈال دیا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو اُس نے دوسری واردا توں کی تفتیش کا مختارِ کُل بنا دیا اور اس واردات سے لاتعلق کر دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل وغیرہ کو بھی اُس نے اِدھر اُدھر کی ڈیوٹیاں دے کر ساہوکار کے قتل کی تفتیش سے دُور ہٹا دیا۔ وہ ہر روز مقتول کے

گھر جاتا تھا۔ دیہات سے وہ جن افراد کو مشتبہ بنا کر لایا تھا انہیں فارغ کر دیا۔ سات آٹھ دن گزر گئے۔

تھانیدار لڑکی کے ساتھ لاپتہ

ایک شام اُس نے دو گھوڑے منگوائے اور اپنے سٹاف سے کہا کہ وہ لڑکی کو اُس کے گاؤں لے جا رہا ہے کیونکہ وہ ایک نشاندہی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ تھانیدار نے یہ نہ بتایا کہ یہ کیسی نشاندہی ہے۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ وہ اکیلا جا رہا ہے، سب کو حیران کر دیا۔ وہ کسی کانسٹیبل تک کو ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔ یہ لڑکی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی جو قصبے سے پانچ چھ میل دُور تھا۔

تھانیدار کو دن کے وقت جانا چاہیئے تھا مگر وہ سورج غروب ہونے کے بعد جا رہا تھا۔ اُسے کہا گیا کہ علاقہ خطرناک ہے وہ رات کو نہ جائے۔ اگر رات کو ہی جانا ہے تو تین چار کانسٹیبل ساتھ لیتا جائے۔ اُس نے کہا کہ لڑکی نے ایک گہرے راز سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ وہ لڑکی کے ساتھ اُس کے گاؤں جا رہا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں جائے گا۔ کانسٹیبل ساتھ ہوئے تو بھی ظاہر ہو جائے گا کہ پولیس جا رہی ہے۔ اُس کے پاس ریوالور اور اٹھارہ گولیاں تھیں جن میں سے چھ ریوالور میں بھری تھیں۔

سورج غروب ہونے کے بعد لڑکی اکیلی تھانے میں آئی۔ تھانیدار اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے تیار تھے۔ لڑکی نے موٹی چادر اس طرح اُوپر لے رکھی تھی کہ اُس کا پورا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی تھانیدار اُٹھا۔ باہر جا کر لڑکی کو گھوڑے پر سوار کیا۔ خود دوسرے گھوڑے پر سوار ہُوا اور دونوں گھوڑے چلے گئے۔ تھانیدار وردی میں نہیں گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے ان کا تھانیدار بڑی دلیری سے حماقت کر رہا ہے۔ علاقہ خطرناک تھا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ تھانیدار ایک ساہوکار کے قتل کی تفتیش کے لیے جا رہا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ملزم دیکھ رہے ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ واقعی دیکھ رہے تھے تو تھانیدار سیدھا اُن کے پھندے میں جا رہا تھا۔

تیسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے جا رہا تھا۔ کوئی بھی رہزن یا ڈاکو ایسی لڑکی کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اغوا نہ کرے۔ یہ اُن کے لیے بڑی قیمتی لڑکی تھی کسی راجے مہاراجے یا کسی کاروباری آدمی سے وہ اس لڑکی کے منہ مانگے دام وصول کر سکتے تھے۔

تھانیدار چلا گیا پھر واپس نہ آیا۔ لڑکی بھی واپس نہ آئی۔ اے۔ ایس۔ آئی دوسرے دن چند ایک کانسٹیبل ساتھ لے کر لڑکی کے گاؤں گیا۔ لڑکی کے والدین نے بتایا کہ وہاں لڑکی آئی ہے نہ تھانیدار۔ اپنی لڑکی کے متعلق انہوں نے بتایا کہ جب سے شادی ہُوئی ہے تین مرتبہ آئی ہے۔ گاؤں کے معزز لوگوں نے بھی تھانیدار کی آمد کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ چوکیدار کو بھی

علم نہیں تھا۔ دو گھوڑوں کا رات کو گاؤں میں آنا چھپ نہیں سکتا تھا۔

اس ہندو اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے طور پر یقین کر لیا کہ تھانیدار گاؤں میں نہیں گیا۔ تھانیدار نے یہی بتایا تھا کہ وہ لڑکی کے گاؤں جا رہا ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی اُس گاؤں چلا گیا جہاں مقتول وصولی کے لیے گیا اور واپسی پر قتل ہو گیا تھا۔ تھانیدار وہاں بھی نہیں گیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ایک دن اور ایک رات انتظار کیا۔ اگلے دن ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی کہ تھانیدار لاپتہ ہے۔

اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے طور پر جو تفتیش کی تھی اس سے میں نے کچھ اشارے لیے۔ یہ ہندو عقل مند تھا۔ اس سے مجھے کارآمد مشورے ملے لیکن میرا انداز اپنا تھا۔ قتل کی اس واردات کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے ذمّے تھانیدار کی تلاش تھی اور اسے اغوا یا قتل کرنے والے ملزموں کی گرفتاری اور اگر تھانیدار خود کسی وجہ سے فرار ہُوا ہے تو اُس کی گرفتاری اور مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کرنا میرا کام تھا لیکن وہ قتل کی تفتیش کرتے کرتے لاپتہ ہُوا تھا اس لیے مجھے قتل کی واردات کی بھی چھان بین کرنی تھی۔ سراغ اسی سے مِل سکتا تھا۔ نظر مجھے بھی یہی آ رہا تھا کہ تھانیدار رات کے وقت لڑکی کے ساتھ گیا اور رہزنوں کے ہاتھ آ گیا۔ اُس نے مقابلے کی کوشش کی ہو گی۔ مارا گیا ہو گا۔ شاید اُسے کوئی مجرم جانتا ہو کہ یہ تھانیدار ہے اس لیے اُس کی لاش دفن کر دی گئی ہو گی اور غائب کر دی گئی ہو گی مگر کچھ سوال پیدا ہوتے تھے جو ہر شک

کو راستے میں ہی ختم کر کے کوئی اور شک پیدا کر دیتے تھے۔

معمّے اور گورکھ دھندے

تھانیدار لڑکی کو رات کے وقت کیوں لے گیا؟ — اُس نے اے۔ ایس۔ آئی کو بتایا تھا کہ وہ رازداری سے کام لینا چاہتا تھا لیکن ایسے خطرناک علاقے میں وہ اکیلا کیوں گیا؟ — اگر وہ اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ چار چھ کانسٹیبلوں کو دیہاتیوں کے لباس میں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اپنے آگے بھیج سکتا تھا۔ یہ حفاظت کا خفیہ انتظام ہوتا۔ اس سے یہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پولیس جا رہی ہے۔ کیا یہ اُس کی بے پروائی اور بیوقوفی تھی کہ اُس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا؟

اُس نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی تک سے تفتیش کیوں چھپائے رکھی؟

وہ مقتولہ کے گھر وردی کے بغیر جاتا اور اکیلا جاتا تھا۔ کیوں؟ — کم از کم ایک کانسٹیبل اُس کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اگر اُسے اکیلے ہی جانا تھا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ اپنے اسسٹنٹ سے رازداری کیوں؟ — کیا اُسے یہ شک تھا کہ اس کا اے۔ ایس۔ آئی ہندو ہے اور وہ درپردہ ہندو ملزموں کی مدد کرے گا؟ کیا اُسے یہ خدشہ نظر آیا تھا کہ ہندو اے۔ ایس۔ آئی مقتول کی دوسری بیوی کو قتل کے الزام سے بچانا چاہتا تھا اور تھانیدار اپنی تفتیش کو راز میں رکھے ہُوئے تھا؟

کیا اپنے خاوند کو لڑکی نے قتل کرایا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیا اُس کے کسی کے ساتھ درپردہ مراسم تھے یا اُس نے کرائے کے قاتل استعمال کیے ہیں؟

کیا تھانیدار اور لڑکی کو غائب کرنے والے وہی پیشہ ور مجرم تو نہیں جنہوں نے ہندو ساہوکار کو قتل کیا ہے؟

لاپتہ تھانیدار نے اپنے اسسٹنٹ کو واردات کے اگلے روز بتایا تھا کہ ساہوکار کے قاتل رہزن یا ڈکیت نہیں۔ اُسے اس لڑکی پر شک تھا۔

کیا اُس نے لڑکی پر شک کا اظہار کر دیا تھا؟ اگر کر دیا تھا تو کیا لڑکی نے اُسے اپنے حُسن کے پھندے میں پھانس کر اُسے یہ دھوکہ دیا ہے کہ وہ گاؤں چل کر ملزموں کی نشاندہی کرے گی؟ اُس نے پہلے ہی اپنے کسی آدمی کو اطلاع دے دی اور راستے میں تھانیدار کو اغوا یا قتل کرا دیا اور خود اس آدمی کے ساتھ چلی گئی جسے وہ چاہتی تھی؟ اگر ایسا تھا تو لڑکی کو غیر معمولی طور پر چالاک ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی دیہاتن اتنی زیادہ چالاک ہو سکتی ہے۔ میرا یہ شک اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا کہ جس آدمی کے ساتھ اُس کے مراسم تھے یا محبت تھی وہ بہت چالاک اور دلیر ہو گا۔

کیا مقتول کا قاتل مسلمان منشی ہی تو نہیں تھا؟ یا کیا منشی پیغام لے

جانے اور لانے کا کام تو نہیں کرتا تھا؟ لڑکی اسے اُجرت دیتی ہوگی۔

مقتول کے بیٹوں پر شک کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس امکان پر بہت غور کیا۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مقتول کے کسی بیٹے نے اگر اپنے باپ کی نوجوان بیوی کے ساتھ درپردہ دوستانہ گانٹھ لیا ہے تو باپ کو قتل کرانے سے وہ کیا حاصل کرسکتا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ باپ کے مر جانے سے وہ باپ کی بیوی کے ساتھ شادی کرلیتا۔

اگر مجرم پیشہ ور رہزن اور ڈاکو تھے تو میرا کام اور زیادہ مشکل تھا۔ ان لوگوں کو پکڑنا پولیس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کئی بار کسی گروہ کو فوج سے گھیرا گیا پھر بھی مکمل گروہ نہ پکڑا گیا۔ آپ کی دلچسپی کے لیے بتادوں کہ میں دوسری جنگِ عظیم کے دَور کی بات کررہا ہوں۔ ڈاکوؤں کے گروہوں میں بھگوڑے فوجیوں کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ قصہ یوں تھا کہ جنگ میں فوجی مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ جاپان نے حملہ کرکے برما کا فرنٹ بھی کھول دیا تھا۔ ہندوستان میں فوجی بھرتی کا یہ عالم تھا کہ فوجی معیار کو نظرانداز کردیا گیا اور ہر کسی کو بھرتی کرلیا جاتا تھا۔ ڈاکٹری لحاظ سے ناقص جوانوں کو بھی بھرتی کرلیتے تھے۔ بھرتی کرنے والے بڑے دل کش مستقبل کے لالچ دیتے تھے۔ لوگ دھڑا دھڑ بھرتی ہونے لگے۔ انہیں ٹریننگ سنٹروں میں واجبی سی ٹریننگ دے کر آگے بھیج دیا جاتا تھا۔

بعض جوان ٹریننگ سے گھبرا کر بھاگ آتے تھے اور بعض فرنٹ سے پہلی چھٹی پر آتے اور واپس نہیں جاتے تھے۔ جنگ میں فوج سے

بھگوڑا ہونے کی سزا چودہ سال تھی۔ بھگوڑا جس گاؤں کا رہنے والا ہوتا اُس کے تھانے کو حکم دے دیا جاتا تھا کہ اُسے گرفتار کرکے فوج کے حوالے کیا جائے۔ پولیس اُس کے گھر پر چھاپے مارتی رہتی تھی۔ یہاں سے رشوت کا ایک اور ذریعہ پیدا ہوگیا۔ بھگوڑے مزے سے گھروں میں رہتے اور اپنے تھانیدار کو ماہوار طے شُدہ رشوت دیتے تھے مگر ہر بھگوڑا رشوت نہیں دے سکتا تھا۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ بعض تھانیدار کسی بھگوڑے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رشوت کا بھاؤ چڑھا دیتے تھے۔ مجھے ایک ہندو اسسٹنٹ سب انسپکٹر یاد ہے جس نے ایک بھگوڑے کی جوان بیوی کو اپنے گھر بُلا لیا تھا۔ یہ بھی رشوت تھی۔ بھگوڑے نے اسے۔ ایس۔ آئی کو قتل کیا اور غائب ہوگیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ قاتل پکڑا نہیں گیا تھا۔

اس قسم کے بھگوڑوں میں سے بعض ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہوگئے تھے۔ بھرتی ہونے والوں میں مفرور مجرم بھی شامل تھے اور تھوڑی سی تعداد اُن کی بھی تھی جو قتل کرکے بھاگ گئے اور کہیں دُور جاکر بھرتی ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد اُن کا سراغ مِل گیا اور وہ فوج سے بھاگ کر کسی جرائم پیشہ گروہ میں جا ملے۔ اِن بھگوڑوں نے ڈاکوؤں کے گروہوں میں اضافہ بھی کیا اور انہیں فوجی ٹریننگ بھی دے دی۔ جنگ نے دوسرا نقصان یہ دیا کہ ان ڈاکوؤں کے پاس جو آبادیوں سے دُور جنگلوں میں رہتے تھے رائفلیں، سٹین گنیں اور ایمونیشن بھی پہنچنے لگا۔ گرنیڈ ایک عام چیز سمجھی جانے لگی۔ سٹین گن جنگِ عظیم کی پیداوار ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ میں جس علاقے کی واردات سُنا رہا ہوں اس کے دیہاتی علاقے میں منظم رہزنوں اور ڈاکوؤں کے دو گروہ تھے جن میں چند ایک بھگوڑے فوجی بھی شامل ہو گئے تھے اور ان کے پاس جنگ کا جدید اسلحہ بھی آگیا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ نامی گرامی ڈاکوؤں کے ساتھ پولیس خاص قسم کے مخبروں کی وساطت سے رابطہ قائم کر لیا کرتی تھی۔ کسی مفرور ملزم کے متعلق بھی ان سے پوچھ لیا جاتا تھا۔ اُدھر سے جو جواب آتا تھا وہ بالکل صحیح ہُوا کرتا تھا۔ وہ جو بات نہیں بتانا چاہتے تھے اس کے متعلق صاف جواب دے دیتے تھے کہ نہیں بتائیں گے یا یہ کہ انہیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ جو مخبر کسی ڈاکو اور پولیس کے درمیان پیغامات کا تبادلہ کرتے تھے اُن کی جان ہمیشہ خطرے میں رہتی تھی۔ جہاں ڈاکو کی نشاندہی ہو گئی مخبر قتل ہو جاتا تھا۔

مجھے جب یہ خیال آیا کہ تھانیدار اور لڑکی کو ڈاکو لے گئے ہیں تو میں گھبرایا۔ ان سے کسی کو چھڑانا ایک تھانیدار یا اس کے عملے کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی آئی کہ تھانیدار لڑکی کو بھگا لے گیا ہے لیکن اس شک پر میرا دماغ زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ اگر اسے لڑکی اتنی ہی زیادہ پسند آگئی تھی تو وہ اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر سکتا تھا۔ عورت کے معاملے میں وہ اناڑی نہیں کھلاڑی تھا۔

جو کچھ بھی تھا، ایک معمہ تھا اور بڑا ہی پُر اسرار معمہ!

جتنی حسین اتنی ہی چالاک

میں نے سب سے پہلے اس تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی کے کان کھولے۔ تھانے کے سارے سٹاف میں صرف دو کانسٹیبل مسلمان تھے۔ باقی سب ہندو تھے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ اُس کے دل میں جو کچھ ہے وہ میرے سامنے رکھ دے۔ وہ مذہب کو الگ رکھ دے۔ اگر مجھے تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ تھانیدار کی گمشدگی میں اُس کا ہاتھ ہے یا اُس نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تھی تو میں اُسے معطل نہیں کراؤں گا بلکہ عام ملزموں کی طرح حوالات میں بند کر کے ایسا مقدمہ بناؤں گا جو اُسے دس سال سے پہلے جیل سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اگر اُس نے مقتول ساہوکار کے قاتلوں کو اس لیے بچانے کی کوشش کی اور تھانیدار کو غائب کرایا ہے کہ قاتل ہندو اور تھانیدار مسلمان ہے تو میں اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر ایک مسلمان تھانیدار کے اغوا کا انتقام غیر قانونی طریقے سے لوں گا۔ میں نے اُسے کہا ــــ "میں تمہیں تمہارے پورے خاندان سمیت غائب کرا دوں گا۔"

وہ شاید میری عادتوں سے واقف تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور مجھے یقین دلا دیا کہ وہ مجھے جو کچھ بتا چکا ہے وہ سو فی صد سچ ہے۔

"کسی نے تمہاری مُٹھی گرم کی ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ملک صاحب!" — اُس نے پُرزور لہجے میں کہا — "خانصاحب (گمشدہ تھانیدار) نے مجھے اس تفتیش کے قریب نہیں جانے دیا کسی برآمدگی یا نشاندہی کے لیے مجھے بھیجتے تو شاید میری مٹھی گرم ہو جاتی۔ اگر آپ مجھے ہندو سمجھ کر بات کر رہے ہیں تو میری ہمدردی مقتول کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی۔ وہ معزز ہندو تھا۔"

"کسی مُخبر سے تمہیں کچھ پتہ چلا ہوگا۔"

"آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ خان صاحب نے مُخبروں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی رپورٹ اُس کے سوا کسی اور کو نہ دیں۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بھی خبردار کیا اور اُسے کہا کہ اُس نے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تو ساری عمر اُسے جیل سے نہیں نکلنے دوں گا اور اگر اُس نے میرے ساتھ تعاون میں کوتاہی کی تو اُس کے خلاف محکمانہ کارروائی کی بجائے اعانتِ جرم میں عدالت میں لے جاؤں گا۔

یہ ہیڈ کانسٹیبل بھی بے گناہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے مُخبروں کو بلایا۔ ان سے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا سوائے اس کے کہ تھانیدار نے انہیں پہلے روز کہا تھا کہ وہ مقتول کے گھر کے متعلق معلومات حاصل کریں اور اس سلسلے میں انہیں جو کچھ معلوم ہو سکے وہ اُسے بتائیں، مگر دوسرے ہی دن اُس نے مُخبروں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی اور انہیں کہا تھا کہ وہ اُس کے سوا تھانے میں کسی اور کو کچھ نہ بتائیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ میں نے اُن سے جو بات

پوچھی انہوں نے جواب دیا کہ وہ معلوم کر کے بتائیں گے۔

مقتول کے منشی اور دونوں بیٹوں کو بُلا لیا۔ مجھے یاد ہے رات کے دس گیارہ بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ میں نے منشی کو آگ بٹھا لیا اور اُسے کہا کہ وہ مسلمان ہے اور میں بھی مسلمان ہوں۔ ہندو ساہوکار کے قتل کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر وہ قتل کی واردات میں ملوث ہے تو میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے صرف تھانیدار کی گمشدگی اور تلاش کے ساتھ دلچسپی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ مجھ سے عزت کروانا چاہتا ہے تو جو کچھ اُسے معلوم ہے مجھے بتا دے ورنہ جیل پہنچنے تک وہ میرے ہاتھوں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوگا۔

اس آدمی کا قد کاٹھ اچھا اور صورت بھی اچھی تھی۔ میں نے اُس کا دماغ بھی اچھا پایا۔ اُس نے بتایا کہ وہ مقتول کے گھر جایا کرتا تھا۔ مقتول کی دوسری بیوی خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔ میرے چند ایک سوالوں کے بعد اُس نے بلا جھجک کہا — "میں یہ کہنے سے نہیں ڈروں گا کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا رویہ بالکل سرد رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ساہوکار (خاوند) کے ساتھ وہ خوش نہیں تھی۔ وہ موٹا اور پلپلا سا ہوکار جو آٹھ آٹھ دن نہاتا نہیں تھا اس لڑکی کو کس طرح خوش رکھ سکتا تھا۔ لڑکی نے اسے اپنے پاؤں میں بٹھا لیا تھا۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ وہ اس ساہوکار سے مٹھی چاپی کراتی تھی۔"

"مجھے یہ بتاؤ" — میں نے اُسے کہا — "کہ تم نے اس کے ساتھ

کس طرح بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی اور اس نے تمہیں کس طرح دھتکارا تھا؟"

"دھتکارا نہیں تھا"— اُس نے جواب دیا— "میں کوئی ایسا شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں اس کے سامنے ساہوکار کو گالیاں دیتا اور اس لڑکی کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور ہمدردی بھی کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی۔ ایک روز میں نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ مجھے پسند کرے تو میں اُسے اس جہنم سے نکال سکتا ہوں اور اُس کے ہر کام آسکتا ہوں۔ اُس نے تحمل سے جواب دیا— 'میں پہلے روز ہی تمہاری نیت سمجھ گئی تھی۔ مجھے اگر تمہاری ضرورت ہوتی تو پہلے روز ہی بتا دیتی۔ مجھے اس خاوند سے اتنی نفرت ہے کہ کسی روز میرا دماغ خراب ہوگیا تو یہ شخص کسی کو زندہ نظر نہیں آئے گا'— میں نے اُسے کہا کہ مجھے حکم دو۔ یہ تمہیں کل زندہ نظر نہیں آئے گا۔ اُس نے کہا— 'لیکن تم جو قیمت مانگو گے وہ میں نہیں دے سکوں گی'— میں نے اُسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ کھیلوں گا نہیں۔ یہاں سے نکال لے جاؤں گا اور کہیں دُور لے جاکر شادی کروں گا۔ وہ ہنس پڑی اور بات گول کر گئی۔"

"اگر وہ تمہیں کہتی کہ اُس کے خاوند کو قتل کر دو تو تم قتل کر دیتے؟"

"جنابِ والا!"— اُس نے جواب دیا— "میرے اندر تو مضبوط دل اور جگر ہے، وہ اگر کسی بُزدل کو بھی کہتی کہ اس خاوند سے مجھے رہائی دلاؤ میں تمہاری ہو جاؤں گی تو وہ آدمی ساہوکار کے قتل کے لیے تیار

ہو جاتا۔"

"اگر میں تمہیں کہوں کہ ساہوکار کو تم نے قتل کیا ہے تو میرا شک کس طرح رفع کرو گے؟"

"اگر قتل میں نے کیا ہوتا تو میں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا"— اُس نے جواب دیا— "میں قتل سے پہلے لڑکی کو غائب کرتا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو قتل کے بعد لوگ یہ خبر بھی سُنتے کہ ساہوکار کا منشی اور بیوی لاپتہ ہیں۔"

"لڑکی چالاک تھی"؟— میں نے پُوچھا— "ساہوکار کے قتل کے متعلق تم نے بھی سوچا ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قتل اسی نے کرایا ہے"؟

"لڑکی جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی چالاک تھی"— اُس نے جواب دیا— "آدھی بات زبان سے اور آدھی آنکھوں سے کرتی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ ہندو بنئے اور ساہوکار پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں مگر اس لڑکی نے ساہوکار کا بہت پیسہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ رقم میرے ہاتھ سے آتی جاتی تھی۔ لڑکی ان الفاظ میں مجھے اپنے خاوند کے لیے پیغام دیا کرتی تھی۔ 'اُسے کہنا ڈیڑھ سو روپیہ جلدی بھیج دے'— میں جونہی پیغام دیتا ساہوکار ڈیڑھ سو روپیہ یا جتنی رقم کا لڑکی مطالبہ کرے، دے دیتا تھا۔"

"اتنی رقم کا وہ کیا کرتی تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں"— اُس نے جواب دیا۔

"مقتول کے بیٹے کیسے ہیں؟"

"بُدھو" — اُس نے جواب دیا — "بزدل اور کمینے"

"ایسا تو نہیں کہ لڑکی نے اِن میں سے کسی کے ساتھ مراسم پیدا کر رکھے ہوں"؟

"میں اپنی جان کی شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ لڑکی ان دونوں کو نوکروں سے بھی بدتر سمجھتی تھی" — اُس نے جواب دیا — "اِن دونوں میں اتنی جرأت ہی نہیں"۔

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ لڑکی نے اپنے گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ دل لگا رکھا ہو"؟

"میں نے تو بہت کچھ سوچا ہے" — اُس نے جواب دیا — "لیکن لڑکی کے درپردہ مراسم کا مجھے کچھ علم نہیں"۔

"جس روز ساہوکار قتل ہُوا اس سے ایک دو روز پہلے لڑکی کہاں تھی"؟ — میں نے پوچھا — "اپنے گاؤں تو نہیں گئی تھی"؟

"پندرہ سولہ روز پہلے گئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "میں اُس کے ساتھ گیا تھا اور اُسے گاؤں پہنچا کر واپس آگیا تھا۔ قتل سے چھ سات روز پہلے مجھے ساہوکار نے کہا تھا کہ اُسے جا کر لے آؤں۔ میں کرائے کا ٹٹو لے کر گیا اور اُسے لے آیا تھا"۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ساہوکار نے اُسے پہلے بتا رکھا تھا کہ وہ کسی گاؤں میں وصولی کے لیے جائے گا"؟

"مجھے معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا۔

"تھانیدار ہر روز ساہوکار کے گھر جاتا تھا" — میں نے کہا — "تم نے کبھی دیکھا تھا۔ وہ وہاں کیا کرتا تھا"؟

"لڑکی کو کمرے میں بُلا کر دروازے بند کر لیتا تھا" — منشی نے جواب دیا — "تین بار ایسے ہُوا کہ مجھے پتہ چلا کہ تھانیدار گھر آیا بیٹھا ہے۔ میں اس خیال سے وہاں چلا گیا کہ ساہوکار کے بیٹے بُدھو اور بزدل ہیں ڈرتے نہ ہوں۔ دو بار تو میں نے تھانیدار کو کمرے میں بند پایا۔ تیسری بار اُس نے مجھے دیکھ لیا اور کہا کہ تمہاری یہاں کوئی ضرورت نہیں، دکان پر چلے جاؤ۔ میں چلا گیا۔ ساہوکار کے بیٹوں میں سے ایک گھر رہتا تھا۔ ایک روز وہ بیٹا جو گھر تھا وہ بھی دکان پر آگیا۔ میں نے پوچھا کہ تھانیدار چلا گیا ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ گھر میں ہی ہے اور اُس نے کہا ہے کہ تم بھی دکان پر چلے جاؤ۔"

"تھانیدار نے تم سے پوچھ گچھ کی تھی"؟

"اُس نے مجھ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ میں کون ہوں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے بتا دیا۔ اس کے بعد اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا"۔

اپنے تھانیدار بھائی کی بے نیازی اور اُس کا شہزادہ پن مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ لڑکی کے ساتھ عیش و عشرت میں مگن رہا تھا۔ میں ابھی یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کے فریب میں آگیا تھا اور

لڑکی نے اُسے غائب کرا دیا اور خود اپنی مرضی کے آدمی کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ میری خواہش یہ تھی کہ مجھے قتل کی تفتیش میں نہ سر کھپانا پڑے اور کوئی ایسا راستہ مل جائے، جو مجھے تھانیدار تک پہنچا دے مگر میری یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس منشی نے لڑکی کے متعلق مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ میں اُسے سیدھی سادی دیہاتن سمجھتا رہا تھا۔ منشی ذہین اور کم از کم میرے ساتھ مخلص معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے مخبری بھی کرے گا۔

مقتول ساہوکار کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ وہ واقعی بدھو اور بزدل تھا۔ پہلے کانپا پھر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ اندر باہر سے ہندو تھا اور وہ اُن ہندوؤں میں سے تھا جو قابلِ نفرت ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں اُس نے میرے سوالوں کے جواب ایسے دیئے جیسے وہ بے حد خوفزدہ ہو یا چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اُسے پیار سے اور پھر دھمکی سے سیدھا کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں مر گئی تو چھ ماہ بعد اس کے باپ نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ لڑکی کے باپ نے ان سے سُود پر قرض لے رکھا تھا اور ادائیگی کے لیے پریشان رہتا تھا۔ اُس کے پاس ہر ماہ صرف سُود دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار ساہوکار خود اُس کے گاؤں گیا تو اُس کی نظر اس لڑکی پر پڑ گئی۔ اُس نے لڑکی کا رشتہ لے لیا اور سُود میں بہت سی چھوٹ دے دی۔

"گھر میں لڑکی کا سلوک اور رویہ کیسا تھا؟"

"بہت بُرا" — اُس نے جواب دیا — "میرے باپ نے اس لڑکی کو گھر لا کر سخت غلطی کی تھی۔ گھر میں ہم تین آدمی تھے۔ میرا باپ، میں اور میرا بھائی۔ وہ کسی کے بھی ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ اُس نے ہانڈی روٹی کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ باپ نے ہانڈی روٹی اور جھاڑو برتن کے لیے ایک نوکرانی رکھ لی تھی۔"

"نوکرانی اب کہاں ہے؟" — میں نے چونک کر پوچھا۔ نوکر نوکرانیاں تفتیش کے سلسلے میں بڑے کام کی چیزیں ہوتی ہیں۔

"اب اُس نے ہمارا گھر چھوڑ دیا ہے" — اُس نے جواب دیا — "جونہی پولیس ہمارے گھر میں داخل ہوئی وہ ڈر کے مارے بھاگ گئی۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"رہتی نہیں ہے" — اُس نے جواب دیا — "میں اُس کا گھر جانتا ہوں۔"

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو بُلایا اور ساہوکار کے بیٹے سے کہا کہ وہ اسے نوکرانی کا گھر سمجھا دے۔ اُس نے بتایا کہ منشی اُس کا گھر جانتا ہے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ منشی کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل کو بھیج کر اس عورت کو تھانے لے آئے۔

"تمہارے باپ کے ساتھ لڑکی کا سلوک کیسا تھا؟"

"اُس کے ساتھ تو وہ بات بھی نہیں کرتی تھی" — بیٹے نے بتایا — "میرے باپ نے اُس کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دو مرتبہ اپنے کانوں سے سُنا ہے کہ یہ لڑکی کمرے میں میرے باپ سے کہہ رہی تھی — 'نہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالو نہ میری جان کو۔ مجھے آزاد کر دو' — میرا باپ اُس کی منت سماجت کرنے لگا۔ لڑکی اُسے دھمکی دے رہی تھی کہ میں تمہیں قتل کرا سکتی ہوں۔ اس کے جواب میں میرے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی۔ آخر لڑکی نے کہا — 'میرے باپ کا کچھ اور قرضہ معاف کر دو' — میرے باپ نے پانچ سو روپیہ معاف کر دیا۔"

"کُل کتنا قرضہ تھا؟"

"دو ہزار اصل رقم تھی" — اُس نے جواب دیا — "سُود ملا کر ساڑھے چار ہزار ہو گیا ہے۔ یہ شخص جس طرح ادائیگی کر رہا ہے اس طرح قرضہ بڑھتا جائے گا.... دوسری مرتبہ میں نے رات کو سُنا۔ لڑکی میرے باپ سے کہہ رہی تھی — 'سُود پر لکیر پھیر دو' — میرے باپ نے غصّے سے کہا — 'اس سے بہتر ہے کہ میرے گلے پر چھری پھیر دو' — لڑکی نے کہا — 'میں تمہیں چھری سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کہو گے تو وہ بھی پھر جائے گی' — میں کمرے کے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر سُنتا رہا۔ باپ نے ہار مان لی اور کہا کہ سُود پر لکیر پھیر دی ہے۔ لڑکی نے کہا — 'اب کسی روز باقی رقم پر بھی لکیر پھر جائے گی' — میرے باپ نے بڑے

گرم لہجے میں کہا — 'یہ نہیں ہو گا۔ میں تمہارے باپ کو تمہاری بہت قیمت دے چکا ہوں۔ میں اور ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ اور تم نے میری اتنی رقم کے عوض مجھے کیا دیا ہے؟ ہر رات مجھے اپنے کمرے سے نکال دیتی ہو۔ میں آج اس کمرے سے نہیں نکلوں گا' — لڑکی نے غضب ناک آواز میں کہا — 'اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ' — میرے باپ نے کہا — 'کہاں جاؤں؟' — لڑکی بولی — 'اپنی ماں کے پاس.... چلو، اُٹھو یہاں سے' — مجھے ایسی آوازیں سُنائی دیں جیسے وہ میرے باپ کو دھکے دے رہی ہو۔ میں وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔"

"تم ہٹے کٹے جوان اپنے بوڑھے باپ کی بے عزتی کس طرح برداشت کرتے رہے؟"

"نہ دارو غہ مہاراج!" — اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا — "ہم دونوں بھائی تو اُس سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔ میں نے باپ سے کہا تھا کہ اسے چلتا کرے۔ گاؤں چھوڑ آئے مگر باپ نے کہا 'چلتا کیوں کروں؟ رقم خرچ کی ہے' — ہم تو جی، اُس سے دُور ہی رہتے تھے۔ دراصل جی یہ لڑکی مجھے اپنے باپ کی نظر نہیں آتی۔ اس کا باپ تو غریب سا آدمی ہے۔ یہ لڑکی پنجاب کے کسی مسلمان یا پٹھان کی معلوم ہوتی ہے۔"

"گھر میں دو اور انسان تھے" — میں نے کہا — "ایک نوکرانی جو تمہارے گھر میں رہتی تھی۔ دوسرا منشی جو تمہارے گھر آتا جاتا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ اُس کا سلوک کیسا تھا؟"

"بہت اچھا" — اُس نے جواب دیا — "نوکرانی کے ساتھ میں نے اُسے گہری سہیلیوں کی طرح اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا ہے۔ چند ایک بار منشی میری موجودگی میں ہمارے گھر آیا تو میری سوتیلی ماں نے اس سے کام کے علاوہ دوستانہ باتیں کیں۔"

"مثلاً کیا باتیں ہوئیں؟"

اُس نے سوچ کر جواب دیا — "ایک روز اُس نے منشی سے ہنس کر کہا — 'تم اب شادی کر لو' — منشی نے اُسی کی طرح ہنس کر کچھ کہا تو لڑکی بولی۔ 'بدمعاشی کی باتیں نہ سوچا کرو تو تم آدمی بڑے اچھے ہو' — منشی نے کہا — 'وہ تو جھوڑ ہی دی ہیں' — لڑکی نے مسکرا کر کہا — 'نہیں۔ ابھی تمہاری آنکھوں میں کچھ کسر ہے۔ یہ بھی نکال دو۔ کہو تو اپنے گاؤں سے شادی کرا دوں' — اور وہ منشی کے ساتھ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی۔"

"نوکرانی کیسی ہے؟" — میں نے پوچھا — "چالاک ہے یا سیدھی سادی؟"

"وہ بھی تیز عورت ہے" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ اُسے رکھنا پڑا۔"

"یہ بتاؤ کوئی ایسا آدمی ہے جسے تم نہ جانتے ہو اور وہ تمہاری سوتیلی ماں سے ملنے آتا ہو؟"

"میری موجودگی میں کوئی نہیں آیا کبھی۔"

"اپنے منشی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

"اچھا آدمی ہے" — اُس نے جواب دیا — "اس کے خلاف ہمیں کوئی

شکایت نہیں۔"

اُس کے پاس کوئی آتا تھا

یہ آدمی مجھے بڑے کام کی باتیں بتا گیا۔ لڑکی کے متعلق مجھے یقین ہو گیا کہ نڈر ہے اور اس ساہوکار سے وہ اتنی نفرت کرتی تھی کہ انتقام کی کسی بھی حد تک پہنچ سکتی تھی۔ ساہوکار کے بیٹے پر مجھے یہ شک نہ ہوا کہ اُس نے اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ مراسم پیدا کر رکھے ہوں گے۔ وہ تو اُس سے خوفزدہ تھا۔ میں نے اس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ اُس کا بیان اپنے بھائی کے بیان کی تائید کرتا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی سے ڈرا ہوا تھا۔ اُس نے صرف یہ نئی بات بتائی کہ ایک روز وہ گھر آیا تو سوتیلی ماں نے اسے ایک کمرے میں بھیج دیا اور کہا ادھر نہ آنا عورتیں بیٹھی ہیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے صحن میں قدموں کی آواز آئی جو بہت تیز تھی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک آدمی تھا جو تیز تیز باہر نکل گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس لڑکی نے اس آدمی کو اندر بٹھا رکھا تھا۔

"وہ کوئی شہری تھا یا دیہاتی؟"

"میں نے اُس کی پیٹھ دیکھی تھی" — اُس نے جواب دیا — "اُس وقت وہ دروازے سے نکل رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے نظر آیا اور نکل گیا۔ کپڑوں سے وہ دیہاتی لگتا تھا۔ قد بہت اُونچا اور مضبوط تھا۔"

یہ بات بھی صاف ہو کر سامنے آگئی کہ لڑکی نے کسی کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ رابطہ کس کی معرفت قائم تھا۔ مجھے نوکرانی پر شک تھا۔ میں نے ساہوکار کے چھوٹے بیٹے سے پوچھا "کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہاری نوکرانی سارا دن غیر حاضر رہی ہو؟ اُس نے کبھی چھٹی مانگی تھی؟"

"کئی بار ایسے ہوا ہے" — اُس نے جواب دیا — "وہ چھٹی صرف ہماری سوتیلی ماں سے مانگتی تھی۔"

"اُس روز گھر کا کام تمہاری سوتیلی ماں کرتی تھی؟" — میں نے ایک شک کو ذہن میں رکھ کر پوچھا۔

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "سارا کام وہ خود کرتی تھی۔"

"نوکرانی اگلے روز آتی تھی یا اُسی رات تمہارے گھر آتی تھی؟"

اُس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا — "وہ رات کو آتی تھی۔"

"ایسے ہوتا تھا کہ وہ تمہاری سوتیلی ماں کے پاس الگ کمرے میں جا بیٹھتی ہو؟"

"ہاں جی" — اُس نے جواب دیا — "بالکل اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ میری سوتیلی ماں کے ساتھ الگ کمرے میں جا بیٹھتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ میری سوتیلی ماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ نوکروں چاکروں کو اپنے برابر کون بٹھاتا ہے؟"

"تمہاری نوکرانی کا خاوند ہے؟"

"ہے" — اُس نے جواب دیا — "یہیں کہیں محنت مزدوری کرتا ہے۔"

"اپنے منشی کو تم نے کبھی اپنی سوتیلی ماں کے پاس بیٹھے دیکھا ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اس کے ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔"

گمشدہ تھانیدار کے متعلق دونوں بھائیوں نے وہی کچھ بتایا جو منشی نے بتایا تھا۔ تھانیدار ان کی سوتیلی ماں کو کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر لیا کرتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنی سوتیلی ماں سے پوچھتے کہ تھانیدار نے اُس سے کیا پوچھا اور کیا کہا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُنہوں نے بتایا کہ تھانیدار کے چلے جانے کے بعد اُن کی سوتیلی ماں گھبرائی ہوئی نہیں ہوتی تھی بلکہ مطمئن اور خوش خوش سی نظر آتی تھی۔

مجھے اطلاع دی گئی کہ نوکرانی آگئی ہے۔ میں نے دونوں بھائیوں کو گھر بھیج دیا۔ آدھی رات کا وقت ہو گیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ نوکرانی کا خاوند بھی اُس کے ساتھ آگیا۔ آدھی رات کے وقت کسی عورت کو تھانے بلانا معمولی بات نہیں تھی۔ اُس کے خاوند کو ساتھ آنا چاہیئے تھا۔ میں نے نوکرانی کو اپنے پاس بلایا۔ اُس کا خوفزدہ ہونا قدرتی تھا۔ ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اُس نے بھولپن اور سادگی کی اداکاری کی۔ میں نے توجہ نہ دی۔

ایسی عورتوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ عورتیں جو پولیس کے لیے مخبری کرتی ہیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے نظریں نیچے کر لیں۔ میں کچھ دیر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے رہا۔ وہ نظریں اُوپر کرتی اور جھکا لیتی تھی۔ میں نے اُسے پریشان کر دیا۔ اُس کے

چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی چالاکی اور اُستادی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

"تم نے پولیس کے لیے شاید کبھی کام نہیں کیا"— میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا— "ورنہ یوں پولیس سے نہ ڈرتیں۔"

"میں غریب عورت ہوں"— اُس نے مظلوموں کی طرح فریاد کے انداز سے کہا— "لوگوں کے گھروں میں نوکری چاکری کر کے دو روٹیاں کھاتی ہوں۔"

"یہی کام جو تم ساہوکار کی نوجوان بیوی کے لیے کرتی رہی ہو اگر پولیس کے لیے کرو تو اُجرت الگ ملے گی، انعام الگ ملے گا اور عزت الگ ملے گی"— میں نے اُسے کہا— "تمہیں گھر گھر نوکری کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"چولہے چوکے کے سوا میں کر ہی کیا سکتی ہوں"؟— اُس نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔

"تم بہت کچھ کر سکتی ہو"— میں نے کہا— "اور تم نے بہت کچھ کیا ہے۔ تم استاد ہو۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے.... تم نے اس گھر کی نوکری پولیس کو دیکھتے ہی کیوں چھوڑ دی تھی"؟

"پولیس کے ڈر سے"— اُس نے جواب دیا— "میں پولیس سے بہت ڈرتی ہوں۔"

"پولیس سے نہیں"— میں نے کہا— "تم نے ساہوکار کی بیوی کے لیے جو کام کیے تھے تم ان سے ڈر کر بھاگی تھیں۔ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ

تمہاری اور اس لڑکی کی کسی بات اور کسی حرکت کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا؟ میری ایک بات غور سے سُن لو۔ ساہوکار کے قتل کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اگر بتا دو گی کہ ساہوکار کی بیوی نے اُسے کس طرح قتل کرایا ہے تو میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا تھانیدار اس لڑکی کو یا یہ لڑکی تھانیدار کو کہاں لے گئی ہے۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہے۔ خود بتا دو گی تو مزے میں رہو گی۔ نہیں بتاؤ گی تو میں تمہیں بتاؤں گا تم نے کیا کیا ہے۔"

اُس نے ٹال مٹول کی اور رونے کی بھی اداکاری کی۔ میں نے کہا— "تم جب چھٹی کرتی تھیں تو رات کو ساہوکار کی بیوی کے پاس کمرے میں کیوں جا بیٹھتی تھیں"؟— اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے پوچھا— "اس لڑکی کے گاؤں تک تم پیدل جاتی تھی یا ٹٹو پر؟ وہ آدمی قتل سے کتنے دن پہلے ساہوکار کے گھر آیا تھا جس کے پاس نہیں ساہوکار کی بیوی بھیجا کرتی تھی"؟

اُس کا رنگ گندمی تھا، پیلا پڑ گیا۔ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا— "ابھی وقت ہے۔ بتا دو۔ ساری عمر پچھتاتی رہو گی۔ قتل تم نے نہیں کیا۔ تھانیدار اور لڑکی کو تم نے غائب نہیں کیا۔ دل کھول کر میرے آگے رکھ دو اور موج کرو"— مجھے اُس کے خاوند کا خیال آگیا۔ میں نے کہا— "کچھ دیر سوچ لو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں"— میں باہر نکل گیا۔ اُس کا خاوند برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اُسے بُلا کر الگ لے

گیا۔

نوکرانی نے نقاب اُٹھا دیا

"اپنی بیوی کے متعلق تم جو کچھ جانتے ہو مجھے بتا دو" — میں نے اُسے کہا — "ساہوکار کے گھر سے یہ مہینہ ختم ہونے پر پیسے لاتی تھی یا لاتی رہتی تھی؟"

"وہ اسے بہت پیسے دیتی رہتی تھی حضور!" — اُس نے جواب دیا۔

"وہ تو بھاگوان ہے۔ اُس نے ہمارا پیٹ بھر دیا ہے۔ کپڑے بھی دیتی تھی۔"

"میں جو پوچھوں سچ سچ بتا دینا" — میں نے کہا — "ذرا سی بھی اُونچ نیچ کی تو رگڑے جاؤ گے۔ تمہاری بیوی کبھی کبھی ساہوکار کے گھر سے چھٹی کرتی تھی۔ تمہیں معلوم ہے؟"

"معلوم ہے حضور!"

"وہ اُس روز گھر میں رہتی تھی یا کہیں چلی جاتی تھی؟"

"کہیں چلی جاتی تھی۔"

"کہاں؟"

"یہ اُس نے کبھی نہیں بتایا تھا" — اُس نے جواب دیا — "یہی کہتی تھی کہ سیٹھانی کے کام سے جا رہی ہوں۔"

"رات کو واپس آتی تھی؟"

"جی حضور!"

"اُس رات تمہیں پیسے دیتی تھی؟"

"دیتی نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "مجھے دکھا کر ٹرنک میں رکھ دیتی تھی۔"

"تم نے کبھی پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟"

"پوچھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے بتایا کبھی نہیں تھا۔"

"تم کبھی ساہوکار کے گھر گئے تھے؟"

"نہیں حضور!"

میں نے اس سے خاصی دیر پوچھ گچھ کی جس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ اس آدمی کو اپنی بیوی کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ غریب آدمی کے گھر پیسے آتے رہے اور وہ اسی سے خوش رہا۔ میں نے اُسے تسلی دے کر الگ بٹھا دیا اور اندر چلا گیا جہاں اس کی بیوی حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم اور التجا کی اپیل تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم تھانے میں بیٹھی ہو۔ یہاں اگر عادی قاتل اور پتھر دل ڈاکو بھی اپنے بھید کھول دیتے ہیں۔ تم کس کے بھروسے اپنے بھید مجھ سے چھپا رہی ہو؟ جلدی بولو اور اس عذاب سے بچو۔

اُس نے میرے ساتھ وہی باتیں کیں جو اناڑی مجرم اقبالِ جرم سے پہلے کیا کرتے ہیں۔ مجھ سے مدد کے وعدے لیے اور جس راز سے پردہ اُٹھایا وہ یہ تھا:

اُسے مقتول ساہوکار نے اپنے گھر ہانڈی روٹی اور جھاڑو برتن کے

لیے رکھ لیا۔ ساہوکار کی دوسری بیوی نے اُس پر شہزادیوں کی طرح حکم چلائے۔ یہ عورت غریب تھی اور چالاک بھی۔ غربت چالاکی سکھا دیا کرتی ہے۔ اس نوکرانی نے یہ دیکھ لیا کہ اس لڑکی کو اس موٹے، بھدے اور بوڑھے خاوند کے ساتھ بیاہ کر اُسے تنور میں پھینک دیا گیا ہے اور یہ لڑکی ساہوکار سے اور اُس کے دونوں بیٹوں سے نفرت کرتی ہے۔ نوکرانی نے اُس کی یہ دُکھتی رگ پکڑ لی اور اُس پر اپنا اعتماد بٹھا لیا۔ تھوڑے سے دنوں میں ہی وہ اس لڑکی کی مونس و غمخوار اور ہمراز بن گئی۔ اُس نے لڑکی سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔

لڑکی نے ایک روز ساہوکار سے کہا کہ وہ دو چار روز کے لیے اپنے گاؤں جانا چاہتی ہے اور وہ نوکرانی کو ساتھ لے جائے گی۔ ساہوکار میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ لڑکی کو جانے سے روکتا۔ اُس نے ٹٹو منگوائے اور لڑکی کو نوکرانی کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔ وہاں وہ چار پانچ دن رہی۔ اس دوران وہ نوکرانی کو ایک زمیندار کے گھر لے گئی۔ وہاں زمیندار کا جوان بیٹا تھا جو خوبرو تھا۔ لڑکی نے اشاروں میں اس جوان آدمی کو بتایا کہ آئندہ رابطہ اس نوکرانی کی معرفت ہُوا کرے گا۔ انہی دنوں ایک شام اندھیرا گہرا ہُوا تو لڑکی نوکرانی کو ساتھ لیے سیر کے بہانے باہر نکلی۔ گاؤں سے باہر ایک جگہ یہ جوان اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ لڑکی نے نوکرانی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے کہا ــــ "اِسے پہچان لو۔ یہ کبھی کبھی گاؤں میرے گھر آیا کرے گی۔ یہ جس روز آیا کرے گی تمہیں اپنا آپ دکھا دیا کرے گی۔ تم اسے اُسی روز ملا

کرو گے۔"

لڑکی نے نوکرانی کو ایک طرف بھیج دیا اور خود اس آدمی کے ساتھ اندھیرے میں گُم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور نوکرانی کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اُس نے نوکرانی کو بتایا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن لڑکے کے والدین رضامند نہیں تھے کیونکہ وہ امیر لوگ تھے۔ اس آدمی نے لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گا ورنہ ساری عمر اکیلے گزار دے گا۔ وعدے دھرے رہ گئے اور یہ ساہوکار آن ٹپکا۔ اس نے سُود میں چھوٹ دے کر لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

لڑکی گاؤں میں چار پانچ دن رہ کر نوکرانی کے ساتھ شہر واپس آ گئی۔ اس کے بعد اُس نے کئی بار نوکرانی کو گاؤں بھیجا اور اس آدمی کو شہر بلایا۔ یہ آدمی آتا تھا تو نوکرانی موقع محل دیکھ کر اُسے گھر میں داخل کر دیتی اور خود باہر پہرے پر کھڑی رہتی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی اُسے بہت اُجرت دیتی تھی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ دن بدن پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی تو اُس کے منہ سے ایسی باتیں نکلنے لگتی تھیں جیسے اُس کا دماغ اُس کے قابو سے نکل گیا ہو۔

"منشی کے ساتھ اُس کا تعلق کیسا تھا؟" ــــ میں نے پُوچھا۔

"اس لڑکی کا کسی اور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا" ــــ نوکرانی نے جواب دیا ــــ "منشی کے متعلق اُس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ آدمی غلط فہمی میں مبتلا ہے لیکن آدمی اچھا ہے۔ میں اسے کسی روز بتا دوں گی کہ مجھے اس ساہوکار سے نفرت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر مرد کے لیے

کھلونا بن جاؤں گی۔ لڑکی دلیر تھی اور اپنی کرنے والی تھی۔"

ایک روز اُس نے نوکرانی سے کہا — "کل صبح گاؤں جاؤ اور اُسے کہنا کہ ساہوکار پرسوں فلاں گاؤں وصولی کے لیے جا رہا ہے۔"

اگلی صبح نوکرانی گاؤں چلی گئی۔ اُس نے پیغام پہنچا دیا۔ میرے پُوچھنے پر نوکرانی نے مجھے بتایا کہ لڑکی کو ساہوکار نے بتا دیا تھا کہ وہ فلاں گاؤں میں وصولی کے لیے جا رہا ہے۔ نوکرانی نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی نے ساہوکار کو قتل کرانے کا بندوبست کیا تھا۔ ساہوکار چلا گیا پھر واپس نہیں آیا۔ دوسرے دن اُس کا بڑا بیٹا اور منشی اُس گاؤں گئے۔ شام کو ساہوکار کی لاش گھر آ گئی۔ دوسرے دن جب لاش جل رہی تھی تھانیدار آ گیا۔ اُس نے باہر کے لوگوں کو گھر سے نکال دیا۔ ساہوکار کے بیٹوں اور منشی کو گھر رہنے دیا۔ اُس نے کمرے میں بیٹھ کر سب کے بیان لیے۔ شام کو وہ سب کو تھانے لے گیا۔ لڑکی کو بھی ساتھ لے گیا۔ نوکرانی پر اُس کی نظر نہ پڑی۔ وہ اس گھر سے بھاگ کر اپنے گھر جا چھپی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس گھر میں کیا ہوتا رہا ہے۔ اُسے ڈر تھا کہ پولیس اُسے بھی پکڑے گی مگر اُسے پکڑنے کوئی نہ گیا۔ وہ مطمئن ہو چلی تھی کہ اُسے اب کوئی نہیں پکڑے گا۔ اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی ساہوکار کے گھر سے چلی گئی ہے اور اب تھانیدار اس گھر میں نہیں جاتا۔ آخر یہ رات آئی کہ اُسے میرے بلاوے پر ہیڈ کانسٹیبل جگا لایا۔

میں نے اس پر اتنی جرح کی کہ رات گزر گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس

عورت کو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں کہ لڑکی نے گاؤں میں رہنے والے اپنی پسند کے ایک آدمی کو اطلاع دی تھی کہ ساہوکار فلاں دن آ رہا ہے۔ اس پیغام سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی نے اس آدمی کے ساتھ پہلے طے کر رکھا تھا کہ ساہوکار کو قتل کرنا ہے۔ قتل کے بعد ان کا ارادہ غالباً کہیں بھاگ جانے کا ہو گا مگر تھانیدار فوراً پہنچ گیا اور اُس نے لڑکی پر قبضہ کر لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ تھانیدار کو کس نے غائب کیا؟ مجھے یہی نظر آ رہا تھا کہ لڑکی نے اسی آدمی کو پیغام بھجوایا کہ وہ تھانیدار کو لا رہی ہے، اُسے غائب کر دو لیکن پیغام کون لے گیا؟ — میں نے نوکرانی سے بہت پُوچھا۔ دھمکیاں دیں۔ اپنی اُستادی استعمال کی مگر وہ اس معاملے میں کوری معلوم ہوتی تھی۔ پیغام لے جانے والا منشی بھی ہو سکتا تھا مگر وہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لیے مُخبری کرے گا لیکن میں اُس پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے مُخبری کا جھانسہ دے کر وہ میرے راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کر سکتا تھا۔

لڑکی رکھ لو، تھانیدار دے دو

مجھے لڑکی کے گاؤں کے اس مشتبہ آدمی کو فوراً حراست میں لے لینا چاہیئے تھا لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اُس پر ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے کہ پولیس کو اُس پر شک ہے۔ نوکرانی کو استعمال کرنے کی بھی سوچی

لیکن اس میں خطرہ تھا کہ وہ دھوکہ دے جائے گی۔ سوچ سوچ کر میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ خطرے تو قبول کرنے ہی پڑیں گے۔ میں نے نوکرانی کو رات بھر جگائے رکھا تھا۔ اُسے بڑا اچھا کھانا کھلایا اور ایک کمرے میں اُس کے سونے کا انتظام کیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی بلکہ اسے انعام ملے گا۔ اُس کے خاوند کو میں نے اُس کے سامنے تسلی تشفی دی اور سختی سے کہا کہ وہ کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔ دونوں میاں بیوی غربت اور خوف کے مارے میرے قبضے میں آگئے۔ نوکرانی کھاپی کر سو گئی۔

• تھانے کا سٹاف رات بھر کا جاگا ہُوا اونگھ رہا تھا۔ میری نیند غائب تھی۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی اور اس کے کسی بھی آدمی کے ساتھ بے تکلفی یا دوستانہ انداز کی کوئی بات نہ کی۔ ان کے ساتھ میں بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں پتھر ہوں اور میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ میں نے انہیں کہا کہ جب تک تھانیدار نہیں مِل جاتا میں کسی کو سونے نہیں دوں گا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ لڑکی کے گاؤں سے مُکھیا (نمبردار) اور چوکیدار کو اور وہاں کے ایک قابلِ اعتماد اور عقل مند فرد کو فوراً بلاؤ لیکن جو بلانے جائے وہ دیہاتی لباس میں اس انداز سے جائے جیسے کوئی مسافر کسی دوسرے گاؤں جا رہا ہے۔ وہ یہ اطلاع بھی لائے کہ فلاں زمیندار کا بیٹا گاؤں میں ہے یا نہیں۔ مجھے اِن لوگوں کے نام یاد نہیں رہے۔ مسلمان تھانیدار کا میں نام بتانا نہیں چاہتا۔ یہ تو میرے سینے پر لکھا

ہُوا ہے۔

ایک کانسٹیبل کو میرے بتائے ہوئے حُلیے میں گاؤں کو روانہ کر دیا گیا.... نوکرانی تین چار گھنٹے سو کر اُٹھ بیٹھی۔ میں نے اُس کے ساتھ دوستانہ باتیں کیں۔ کچھ اور کھلایا پلایا۔ اس پر تھانے اور پولیس کا جو خوف سوار تھا وہ اُتر گیا۔ یہ میری استادی تھی کہ میں نے اُسے پولیس کا فرد بنا لیا اور وہ بھی اپنے آپ کو پولیس کا فرد سمجھنے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ لڑکی کے گاؤں جائے اور اُس کے ماں باپ پر یہ ظاہر کرے کہ اُس نے اُن کی بیٹی کی بہت خدمت کی ہے اور وہ اسے اپنی بیٹی سمجھتی رہی ہے۔ اس طرح وہ اُن کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا اظہار کر کے معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لڑکی گھر میں ہے یا گھر گئی ہی نہیں۔ اگر اُسے موقع ملے تو اُس آدمی سے بھی ملے جس تک وہ لڑکی کے پیغام لے کر جایا کرتی تھی۔

میں نے اُسے بہت لمبی چوڑی ہدایات دی تھیں اور یہ بھی ذہن میں ڈال دیا تھا کہ اُس نے دھوکہ دیا یا کوئی اطلاع چھپائی اور دانستہ غلط بات بتائی تو اُس کے لیے نتیجہ کیا ہوگا۔ عورت چالاک اور ہوشیار تھی۔ سب کچھ سمجھ گئی۔ میں نے اس کے لیے ٹٹو منگوایا اور اُسے گاؤں کو روانہ کر دیا۔ اُس کی حفاظت کے لیے میں نے دو کانسٹیبل دیہاتی لباس میں اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیئے کہ اس عورت سے دُور دُور دیہاتی مسافروں کی طرح جائیں اور اس پر نظر رکھیں۔ یہ گاؤں تک پہنچ جائے تو کانسٹیبل پیچھے آکر راستے میں بیٹھ جائیں۔ نوکرانی واپس آئے تو اسے اپنی نظر میں رکھ کر

واپس لے آئیں۔

لڑکی کے ماں باپ کو میں نے ابھی پردے کے پیچھے رکھا ہُوا تھا۔ قاعدے کے مطابق اُن کے گھر چھاپہ مارنا چاہئے تھا لیکن میں ملزموں کو چوکنّا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ پہلو بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر تھانیدار اور لڑکی کو پیشہ ور مجرم اُڑا لے گئے ہیں تو انہوں نے پولیس کی ہر ایک حرکت اور کارروائی پر نظر رکھی ہوئی ہوگی، اس لیے میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ میری کوئی حرکت ملزموں کو نظر نہ آئے اور وہ میرے ارادوں کو قبل از وقت نہ سمجھ سکیں۔

نوکرانی اور دوسرے افراد کو گاؤں بھیج کر میں اسے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ اس مسئلے پر بات چیت کرنے لگا کہ اس علاقے کے جو پیشہ ور دو تین گروہ ہیں اُن تک کس طرح رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ تھانیدار اور لڑکی ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے پاس ہیں تو انہیں دلچسپی لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ میں اُن کے ساتھ درپردہ سودا کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہمارا تھانیدار واپس کر دیں۔ میں اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ تھانیدار کی رہائی کی صورت میں میں نے یہ سوچا تھا کہ اس سے یہ بیان لکھواؤں گا کہ وہ ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہے مگر سوال یہ تھا، کیا تھانیدار ابھی تک زندہ ہے؟

گاؤں بے خبر تھا

رات وہ تمام لوگ تھانے میں آ گئے جنہیں بلایا گیا تھا۔ ان میں گاؤں کا نمبردار تھا، چوکیدار اور دو مُخبر تھے۔ ان سے کچھ دیر بعد نوکرانی آ گئی۔ میں سب سے پہلے اُسے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ لڑکی کے گھر گئی تو اُس کے ماں باپ نے لڑکی کے متعلق بے صبری سے پوچھا کہ وہ کیسی ہے اور وہ گھر یعنی گاؤں آئے گی یا نہیں؟ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ پولیس اُسے اب بھی پریشان کرتی ہے یا نہیں؟

میں نے آپ کو غالباً یہ نہیں بتایا کہ لڑکی کے ماں باپ اُس کے خاوند کے قتل کے روز اُس کے گھر گئے اور دوسرے دن واپس آ گئے تھے۔ انہیں تھانیدار نے کہا تھا کہ وہ چلے جائیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ انہیں تھانیدار نے کیوں گاؤں بھیج دیا تھا۔

نوکرانی نے جب دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ کو معلوم ہی نہیں کہ لڑکی لاپتہ ہے تو اُس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ انہیں بتا دے کہ لڑکی تھانیدار سمیت لاپتہ ہے یا انہیں اس دھوکے میں رکھے کہ وہ خیریت سے ہے۔ نوکرانی چونکہ چالاک تھی اس لیے اُس نے پہلے تو یہ یقین کرنے کی کوشش کی کہ یہ دونوں جھوٹ نہیں بول رہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُن کا انداز بتاتا تھا کہ انہیں کچھ علم نہیں کہ اُن کی لڑکی کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور وہ کہاں ہے۔ نوکرانی نے انہیں کہا کہ وہ اُن کی لڑکی کا پیغام لے کر آئی ہے کہ اُس کے متعلق فکر نہ کریں۔ پولیس نے تفتیش ختم کر دی ہے۔ وہ کسی روز گاؤں آ جائے گی پھر یہیں رہے گی۔ نوکرانی نے انہیں یہ یقین دلایا کہ اُن کی بیٹی ہمیشہ کے لیے اُن کے گھر آ رہی ہے۔

یہ سُن کر لڑکی کے ماں باپ کے آنسو بہنے لگے۔ اُن کے لیے غم یہ نہیں تھا کہ ساہوکار مر گیا تھا، اُن کا اصل غم یہ تھا کہ اُن کی بیٹی کو ساری عمر بیوہ رہنا تھا۔ ہندوؤں کا مذہب اس قدر بے رحم ہے کہ بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی خواہ وہ پہلے روز ہی بیوہ ہو جائے۔ میں نے پندرہ سولہ سال کی عمر کی بیوہ لڑکیاں دیکھی ہیں۔ بیوہ کے ساتھ دوسرا ظلم یہ ہوتا ہے کہ اُس کی سہیلیوں کو اُس کے پاس نہیں بیٹھنے دیا جاتا اور وہ اگر نوعمر ہی ہو وہ چوڑیاں بھی نہیں چڑھا سکتی اور لڑکیوں کی طرح صاف ستھرے کپڑے بھی نہیں پہن سکتی۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو اپنی بیٹی کا یہی حشر نظر آ رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اتنی خوبصورت بیٹی ساری عمر کے لیے بیکار ہو گئی ہے۔ لڑکی کی ماں نے نوکرانی کے ساتھ اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ لڑکی نڈر اور سرکش ہے اس لیے وہ اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کی پرواہ نہیں کرے گی اور وہ اپنی جوانی اور اپنی امنگوں کی تسکین کرتی پھرے گی۔

"وہ راکھشش بھی اسی گاؤں میں ہے" — ماں نے نوکرانی سے کہا۔ وہ اُس آدمی کی بات کر رہی تھی جسے لڑکی چاہتی تھی۔ ماں کو معلوم تھا کہ اُس کی بیٹی کے اس آدمی کے ساتھ در پردہ مراسم ہیں۔ ماں نے کہا — "یہ ملیچھ ہماری عزت کا خیال نہیں کرے گا۔ لڑکی پر ہم کس طرح پہرے لگا کر رکھیں گے"۔

نوکرانی نے اس آدمی کے اتفاقیہ ذکر سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں میں ہی ہے۔ وہ اس گھر سے اُٹھی اور زمیندار کے گھر چلی

گئی۔ وہاں بھی اُس سے پوچھا گیا کہ ساہوکار کے قتل کا کوئی مجرم پکڑا گیا ہے یا نہیں اور لڑکی کب گاؤں آئے گی۔ نوکرانی نے انہیں بتایا کہ وہ لڑکی کے والدین کو یہی پیغام دینے آئی تھی کہ وہ چار دنوں تک گاؤں آ جائے گی۔ نوکرانی کو معلوم تھا کہ وہ آدمی اُسے باہر ملے گا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے باہر نکل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ وہ آدمی پیچھے سے اُس کے ساتھ جا ملا۔ نوکرانی نے چلتے چلتے اُسے کہا کہ میں واپس جا رہی ہوں، مجھے راستے میں ملنا جہاں کوئی اور نہ دیکھ سکے۔ وہ الگ ہو گئے۔

وہ جب ٹٹو پر سوار ہو کر گاؤں سے نکلی تو کچھ دُور وہ آدمی کھڑا تھا۔ میں نے نوکرانی کی حفاظت کے لیے دیہاتیوں کے بھیس میں جو دو کانسٹیبل بھیجے تھے انہوں نے اس کی تصدیق کی تھی کہ ایک آدمی اُسے راستے میں ملا تھا۔ یہ کانسٹیبل دُور دُور سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نوکرانی نے مجھے بتایا کہ اس آدمی نے اس سے لڑکی کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسی ہے اور گاؤں کب آ رہی ہے۔

نوکرانی نے اُسے ذرا غصّے سے کہا — "تم کیسے مرد ہو؟ وہ بیچاری مصیبت میں پھنسی رہی اور تم نے جا کر اُسے دُور سے بھی نہیں دیکھا"۔

"اُس نے کیا کہلا بھیجا ہے؟" — اُس نے پوچھا — "اُس نے مجھے بلایا ہے؟"

"اُس نے ابھی صرف خیریت کی خبر دی ہے" — نوکرانی نے اُسے کہا — "میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ تمہیں شہر آنے کی کہوں؟ اُس نے

کہا تھا کہ ابھی نہیں اور اُس نے خاص بات یہ کہی ہے کہ میں گاؤں میں نہیں آؤں گی۔ وہاں آئی تو گھر میں قید ہو جاؤں گی۔ جب ضرورت سمجھی تمہیں شہر بلا لوں گی"۔

"اُسے کہنا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے اُس کی پرواہ نہیں کی"—اس جوان آدمی نے کہا—"اُسے کہنا کہ تم تو جانتی ہو کہ میرا ابھی شہر آنا ٹھیک نہیں۔ پھر بھی میں ایک روز گیا تھا۔ میں نے تمہارے گھر میں تھانیدار کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں واپس آگیا۔ مجھے جب بلاؤ گی آجاؤں گا۔ گاؤں میں آؤ گی تو جب کھو گی چل پڑیں گے۔ گھر کی قید سے آزاد ہونا کوئی مشکل نہیں"۔

صیّاد دام میں آگیا

یہ آدمی دلیر ہو سکتا تھا مگر بیوقوف ضرور تھا۔ بیوقوفی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُسے اس نوکرانی پر مکمل اعتماد تھا اور دوسری وجہ لڑکی کی خوبصورتی تھی جسے دیکھ کر ہر کوئی ٹھٹھک جاتا تھا۔ اس آدمی کی جوانی اور دیہاتی پن کا بھی قصور تھا۔ اُس نے نوکرانی کو یہ پیغام بھی دیا کہ اُس نے کچھ رقم اپنے پاس رکھ لی ہے اور وہ (لڑکی) بھی جتنی رقم اُڑا سکے الگ رکھ لے۔ آگے چل کر بہت ضرورت پڑے گی۔ لڑکی سارے زیورات بھی الگ باندھ لے۔ اُس نے نوکرانی سے یہ بھی پوچھا کہ پولیس نے کیا کھوج لگایا ہے۔ نوکرانی نے اُسے بتایا کہ تھانیدار نے لکھ دیا ہے کہ ساہوکار کو ڈاکوؤں نے

قتل کر کے لُوٹ لیا ہے اور پولیس نے اپنی کارروائی ختم کر دی ہے۔

"یہ سُن کر وہ خوش ہُوا تھا یا اُس کا رویّہ کیا تھا؟"—میں نے نوکرانی سے پوچھا۔

"بہت ہی خوش ہُوا تھا"—نوکرانی نے جواب دیا—"اُس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے دو تین بار مجھ سے پوچھا تھا کہ تم سچ کہتی ہو پولیس نے کارروائی ختم کر دی ہے؟—تب میں نے اُسے کہا—"میں تھوڑے سے انعام پر راضی نہیں ہوں گی بھگوان نے تمہارے کھاتے کا خون ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور پولیس کو بھی اندھا کر دیا ہے تم نے پھول کو آگ سے نکال لیا ہے۔ ساہوکار جیسے راکشش کا خون پُن ہے پاپ نہیں۔ بھگوان نے اسی لیے تمہیں صاف بچا لیا ہے"—اُس نے مست سا ہو کے کہا—"ہمارے راستے میں جو آئے گا اُس کا خون ہو گا۔ تم جو انعام مانگو گی ملے گا۔ اُسے کہنا تیار رہے اور مجھے بُلا لے"—میں اُسے تسلّی دے کر آگئی"۔

میں نوکرانی کو چالاک سمجھتا تھا لیکن مجھے بالکل توقع نہیں تھی وہ اس قدر چالاک اور ذہین ہو گی۔ میں نے اُسے بہت سی ہدایات دے کر بھیجا تھا لیکن اُس نے ان کی راہنمائی میں بہت زیادہ کام کر دکھایا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ گاؤں والوں کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ لڑکی اور تھانیدار لاپتہ ہیں مگر وہاں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ لڑکی کے اس آدمی کو بھی معلوم نہیں تھا۔

میں نے اس آدمی کی لاعلمی سے فائدہ اُٹھانے کی ترکیب سوچی نمبردار

چوکیدار اور مُخبر جو گاؤں سے آئے تھے انہیں الگ الگ کمرے میں بُلایا۔ ان سے مجھے یہ پتہ چلا کہ لڑکی اور اس آدمی کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اس سے زیادہ لڑکی کے خلاف کوئی الزام نہیں۔ اس آدمی کے متعلق بتایا گیا کہ خوب صورت جوان ہے۔ گھر میں چونکہ دانے ہیں اس لیے اس میں دلیری بھی ہے اور عقل بھی۔ کوئی اسے کم عقل نہیں کہہ سکتا۔

میں نے ان سب سے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں۔ کسی حد تک میرا مطلب پورا ہوگیا۔ ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ تھانیدار اور لڑکی لاپتہ ہیں، حالانکہ اسے۔ ایس۔ آئی گاؤں میں یہ معلوم کرنے گیا بھی تھا کہ تھانیدار لڑکی کو ساتھ لے کر گاؤں آیا تھا، وہ اب کہاں ہے۔ نمبردار اور چوکیدار نے اُسے بتایا تھا کہ تھانیدار گاؤں میں نہیں آیا۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تھانیدار لاپتہ ہوگیا ہے میں نے اُنہیں بتا دیا اور انہیں چند ایک ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔ دونوں مُخبر ذہین تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ رہزنوں یا ڈکیتوں کے اُس گروہ کا کھوج لگائیں جن کے قبضے میں لڑکی ہے۔ اب تو میں یہی کہہ سکتا تھا کہ تھانیدار اور لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔

میں نے دوسرے ہی دن ساہوکار کے بڑے بیٹے کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ دے۔ وہ رقم لے آیا۔ اُس دَور کا ڈیڑھ سو روپیہ آج کے ڈیڑھ ہزار کے برابر تھا۔ میں نے یہ رقم نوکرانی کو دے کر کہا کہ وہ آج پھر گاؤں جائے اور یہ رقم لڑکی کے ماں باپ کو دے کر کہے

کہ اُن کی بیٹی نے بھیجی ہے۔

یہ میں نے نوکرانی کے لیے گاؤں میں جانے کا بہانہ بنایا تھا۔ وہ ایک ہی روز پہلے وہاں سے ہو کر آئی تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس آدمی سے مل کر اُسے یہ پیغام دے کہ اُسے لڑکی نے فوراً بُلایا ہے، اُسے ساتھ لیتی آئے اور ساہوکار کے گھر میں داخل کر دے۔

نوکرانی ٹٹو پر سوار ہو کر چلی گئی۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے نوکرانی میری ہدایت کے مطابق تھانے کے سامنے سے گزری۔ میں نے ایک کانسٹیبل باہر کھڑا کر رکھا تھا۔ اُس نے مجھے اطلاع دی کہ نوکرانی اشارہ کر گئی ہے کہ کام ٹھیک ہے۔ ساہوکار کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے میں نے ایک مُخبر بھیج رکھا تھا۔ ساہوکار کے بڑے بیٹے سے میں نے کہہ دیا تھا کہ گھر کھُلا رکھے اور گھر میں کوئی نہ جائے۔

میں ساہوکار کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ اسے۔ ایس۔ آئی کو میں نے بتا دیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ میں خدا سے التجائیں کرتا جا رہا تھا کہ میرا پلان کامیاب رہے۔

پلان میں کچھ گڑبڑ ہو گئی لیکن خدا نے پھر بھی مدد کی۔ ایک غلطی مجھ سے بھی ہو گئی تھی۔ چاہیئے یہ تھا کہ گھر کے کسی کمرے میں پہلے ہی ایک دو کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود ہوتا۔ میں نے اس کی بجائے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ آدمی اندر چلا جائے تو میں اندر جاؤں گا۔ عین وقت پر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ

آدمی اندر چلا گیا اور وہاں لڑکی اُسے نہ ملی تو وہ اسے دھوکہ سمجھ کر بھاگ جائے گا۔ وقت کی ذرا سی گڑبڑ سے سارا کھیل تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

میں جب ساہوکار کی گلی میں داخل ہُوا تو مجھے ایک گھر کے سامنے نوکرانی کھڑی نظر آئی۔ گلی میں بچّے کھیل رہے تھے۔ دو آدمی میری سمت آ رہے تھے۔ ایک جواں سال آدمی پیچھے سے آیا اور میرے قریب سے گزر گیا۔ میں وردی میں نہیں تھا۔

وہ نوکرانی کے بالکل قریب سے گزرا۔ چند قدم آگے جا کر واپس آ گیا۔ میں آگے چلا گیا۔ گھوم کر دیکھا۔ وہ آدمی ساہوکار کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ نوکرانی اُس کے پیچھے تھی۔ میں مُڑا اور تیزی سے ساہوکار کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ میرا مُخبر گلی کی نکڑ پر کھڑا تھا، دوڑا آیا۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہُوا۔ آگے ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے کواڑوں میں سے جھانکا۔ نوکرانی نے اس خوبرو جوان کو ایک کمرے میں داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے مُخبر کے کان میں کہا کہ دوسری گلی میں اے۔ ایس۔ آئی اور دو کانسٹیبل کھڑے ہیں، انہیں بلا لاؤ۔

میں اندر چلا گیا اور اُس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں وہ بیٹھا تھا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بے چارہ سمجھا کہ لڑکی نے دروازہ کھولا ہے۔ دروازے جتنے اُونچے قد اور ایک کواڑ جتنے چوڑے سینے والے آدمی کو دروازے میں دیکھ کر اُس کی مسکراہٹ اس طرح غائب ہو گئی جس طرح جلتے بلب کا سوئچ آف کر دیا جاتا ہے۔

"بیٹھو دوست!" ۔۔۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔ "وہ نہیں آئے گی جس کے لیے تم آئے ہو۔"

"آپ کون ہیں؟" ۔۔۔ اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پُوچھا۔

"ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "صرف پہچانتے نہیں۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ۔۔۔ "رام۔ رام میں چلتا ہوں۔ یہ لوگ دکان پہ ہوں گے۔"

میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور مسکرا کر کہا ۔۔۔ "میں تم سے ملنے آیا ہوں اور تم اُٹھ کر چل دیئے۔ بیٹھو یار۔"

اتنے میں باوردی اے۔ ایس۔ آئی دو باوردی کانسٹیبلوں کے ساتھ صحن میں داخل ہُوا۔ یہ آدمی چارپائی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے اُسے دھیمے سے پوچھا ۔۔۔ "ہتھکڑیوں میں تھانے چلو گے یا یہیں سب کچھ بتا دو گے؟"

اُس کے ہونٹ ہلے مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ میرے لیے اُس کا یہ ردِ عمل انوکھا نہیں تھا۔ قتل کرنے تک تو انسان اپنے آپ کو دلیر اور جواں مرد سمجھتا رہتا ہے، دلیری کی صحیح ضرورت تو اس کے بعد ہوتی ہے جو کسی بھی قاتل کو حاصل نہیں ہوتی۔ قتل کے بعد پولیس کی صرف وردی دیکھ کر قاتل کا پسینہ نکل آتا ہے۔ میں نے اِس آدمی کے چہرے سے پہچان لیا کہ اقبالِ جُرم کے لیے مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ اے۔ ایس۔ آئی اور کانسٹیبل کمرے میں اُس کے

سامنے کھڑے تھے۔

"چلو تھانے چل کر بات کرتے ہیں"۔۔۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ڈرو نہیں۔"

"ہتھکڑی نہ لگانا"۔ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں لگائیں گے"۔۔۔ میں نے شفقت سے کہا۔ "تمہاری عزت میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔"

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر تھانے چلا چلے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔

تھانیدار اور لڑکی زخمی ہو گئے

وہ سب باہر نکل گئے۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ ہم دونوں کمرے سے نکلے۔ نوکرانی صحن میں کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ جوان سال ملزم نے اُسے دیکھا تو اُس نے جست لگائی اور نوکرانی کے منہ پر اتنی زور سے گھونسہ مارا کہ بے چاری دُور پیچھے جا پڑی۔ وہ اُس کی طرف گیا۔ میں نے دوڑ کر پیچھے سے اُس کی گردن پر گھونسہ جمایا۔ اللہ نے مجھے بازو لمبے اور ہاتھ بڑے بھاری دیئے ہیں۔ میرے گھونسے سے وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں نے اُسے کلائی سے پکڑ کر گھما دیا اور پہلو میں ایک اور گھونسہ مارا۔ اُس کے منہ سے ہائے نکلی اور وہ پہلو کے بل گر پڑا۔ لیٹے لیٹے اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

نوکرانی کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہ رہا تھا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُسے کہا کہ نوکرانی کو ہسپتال لے جاؤ اور اس کے ہونٹ پر دوائی لگواؤ۔ جس کانسٹیبل کے پاس ہتھکڑی تھی اُسے کہا کہ ملزم کو ہتھکڑی لگا لو۔ میرے دو گھونسوں نے اُس کی جوانمردی ختم کر دی تھی۔

تھانے کی حوالات میں اُس روز دو پیشہ ور ملزم بند تھے۔ میں نے تھانے جا کر انہیں کہا کہ قتل کا ایک ملزم تمہارے ساتھ بند کیا جا رہا ہے۔ اسے سزا سے نہیں ڈرانا لیکن تھانے کی اذیتوں اور مار کٹائی سے ڈراتے رہنا اور اسے سونے نہ دینا۔ میں آدھی رات کے بعد اسے تفتیش کے لیے نکالوں گا۔ یہ ملزم جانتے تھے کہ میرا مطلب کیا ہے۔ میں تشدد بلکہ ذرا سی سختی کا بھی قائل نہیں تھا لیکن اُس نے نوکرانی کے منہ پر گھونسہ مارا تو مجھے ایسے لگا جیسے اُس نے میرے منہ پر گھونسہ مارا ہے۔ نوکرانی غربت کی ماری پہلے اس لڑکی کے ہاتھ میں کھیلتی رہی پھر میری آلۂ کار بن گئی۔ مجھے اس کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ میں اس ملزم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نوکرانی کو اے۔ ایس۔ آئی ہسپتال سے لے آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا اُوپر والا ہونٹ سُوج گیا تھا۔ میں نے اُس کے لیے دودھ منگوایا اور اُسے کہا کہ وہ دودھ پی کر گھر چلی جائے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ کل اُسے کچھ پیسے دوں گا۔ وہ صبح آ جائے۔

میں آرام کے لیے چلا گیا۔ مسلسل کام نے ادھ موا کر دیا تھا۔

کھانا کھا کر میں لیٹا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل دوڑا آیا۔ کہنے لگا۔ "جلدی

آئیں۔ دُور کے دو دیہاتی کوئی رپورٹ لائے ہیں"۔

میں دوڑا گیا۔ بارہ تیرہ میل دُور کے دو دیہاتی اسے۔ ایس۔ آئی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے یہ خبر دی کہ آج صبح کے اندھیرے میں اُن کے گاؤں میں ایک آدمی آیا جس کے جسم پر بہت سے زخم ہیں۔ اُس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے۔ وہ بھی کچھ زخمی ہے۔ اس زخمی آدمی نے اپنا نام بتا کر کہا کہ وہ اس تھانے کا تھانیدار ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اُس کے جاننے والے نکل آئے۔ اُسے اپنے گھر لے گئے اور جو مرہم پٹی ہو سکتی تھی وہ کی۔ ہمیں یہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے کہ اسے۔ ایس۔ آئی اس گاؤں آ کر اُسے لے جائے۔ وہ ابھی گھوڑے یا ٹٹو کی سواری کے قابل نہیں۔

یہ ہمارا نگشدہ تھانیدار تھا اور اُس کے ساتھ ساہوکار کی نوجوان بیوہ تھی۔ پیغام لانے والے دونوں دیہاتیوں کو معلوم نہیں تھا کہ تھانیدار کہاں اور کس طرح زخمی ہُوا ہے۔ اُس نے اسے۔ ایس۔ آئی کو بلایا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں بھی اُس کے تھانے میں موجود ہوں۔ مجھے رات کو اس آدمی سے اقبالِ جرم کرانا تھا جسے میں نے ساہوکار کے گھر سے پکڑا تھا لیکن تھانیدار کو لانے کے لیے مجھے ہی جانا چاہیئے تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی گمشدگی اور زخمی ہونے کا پس منظر کیا ہے۔ وہ مسلمان تھا اس لیے میں ہندو اسے۔ ایس۔ آئی کو جانے سے روکنا مناسب سمجھتا تھا۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ میں صبح تک نہ آیا تو وہ ملزم کا ریمانڈ لے لے اور ابھی اس سے کوئی بیان نہ لے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ چھ کانسٹیبل لیے۔ انہیں رائفلیں دلوائیں۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ وہ پیدل چلنے کا زمانہ تھا مگر ہمیں جلدی پہنچنا تھا۔ اسے ایس۔ آئی نے تھوڑے سے وقت میں دو گھوڑوں اور چھ ٹٹوؤں کا انتظام کر دیا۔ دونوں دیہاتی گھوڑوں پر آئے تھے۔ ٹارچیں لیں۔ رات تاریک ہو چکی تھی۔ ہم سب روانہ ہو گئے۔ علاقے کے متعلق بتا چکا ہوں کہ چٹانی اور اُونچا نیچا تھا۔ ہماری رفتار اچھی تھی۔ تین گھنٹوں کے اندر اُس گاؤں پہنچ گئے۔ دیہاتی ہمیں اُس گھر لے گئے جہاں تھانیدار تھا۔ یہ گاؤں کے بڑے زمیندار کا گھر تھا۔

لڑکی نے پاگل کیا

تھانیدار پلنگ پر پڑا تھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر تھانیدار کی آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں۔ بولا ــــ "اوئے ملک؟ تم کیسے آئے؟"

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور پُوچھا کہ زخم کیسے ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔

"کوئی زیادہ گہرے نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا اور ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا جو پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ وہ چلا گیا تو اُس نے اپنے میزبان کو بھی کمرے سے نکال دیا۔

"زخم اتنے گہرے نہیں کہ میں تھانے تک نہ پہنچ سکتا" ــــ تھانیدار نے کہا ــــ "میں دراصل اسے۔ ایس۔ آئی کو یہاں بلانا چاہتا تھا۔ اُس کے ساتھ بات کر کے مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا کروں۔ تم آ گئے ہو۔ یہ اچھا ہی ہُوا ہے

اور بُرا بھی۔ اچھا اس لیے کہ تم مسلمان ہو میں جس مدد کا طلبگار ایک ہندو سے تھا وہ تم سے مل سکتی ہے۔ بُرا اس لیے ہُوا کہ تم ہر جگہ اخلاق اور اپنا مذہب لیے پھرتے ہو، اگر تم نے میرے کیس میں بھی حاکمِ وقت کے ساتھ وفاداری کی تو میں مارا جاؤں گا کہو مدد کرو گے نا؟" اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔ "میری نوکری اور میری عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں نے ایک سنگین جُرم کیا ہے۔ میں نے اس پر پردہ ڈالنے کی ترکیب سوچ رکھی ہے۔" اُس نے پوچھا۔ "تمہیں میرے تھانے میں تعینات کر دیا گیا ہے؟"

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "مجھے تمہیں زندہ یا مُردہ برآمد کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے .... اور میں نے تمہارے ساہوکار کا قاتل بھی پکڑ لیا ہے۔ ابھی اُس نے اقبالی بیان نہیں دیا۔ دے دے گا۔"

"وہ ساہوکار کی دوسری بیوی کے گاؤں کا ہے نا؟" اُس نے اِس آدمی کا نام لے کر کہا۔ "مجھے لڑکی بتا چکی ہے .... لڑکی دیکھو گے؟ لیکن تم دین اور ایمان کے مارے ہوئے انسان ایسے حُسن کی قدر کرنا کیا جانو۔ مجھے تو کمبخت نے پاگل کر دیا تھا۔ تم مُردہ دل ساری سروس اقبالِ جُرم کراتے پُوری کر جاؤ گے"۔ اُس نے کسی کو آواز دی۔ اِس حالت میں بھی یہ شخص زندہ دل اور رنگین مزاج تھا۔

میزبان اندر آیا تو تھانیدار نے اُسے کہا کہ لڑکی کو ادھر بھیج دو۔

لڑکی جب آئی تو میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ کسی دیہاتی ہندو کسان کی بیٹی ہے۔ وہ بڑی ہی خوبصورت پٹھان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں بھی اسے۔ ایس۔ آئی کی طرح کہوں گا کہ اُس کی خوبصورتی عجیب و غریب تھی۔ یہ آنکھیں

اور یہ بال اور یہ رنگ اس علاقے کا نہیں تھا۔ میں نے ابھی اُس کی ماں کو اور اُس کے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے اندر بھیج دیا اور تھانیدار سے کہا کہ وہ مجھے سچی بات سُنائے۔

"میں نے تمہیں لڑکی صرف اس لیے دکھائی ہے کہ تم سمجھ سکو کہ اس کی خاطر کوئی بھی آدمی کسی بھی آدمی کو قتل کر سکتا ہے"۔ اُس نے کہا۔ "اور میں نے جو جُرم کیا ہے وہ بے شک سنگین ہے لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر تم بھی کہو گے کہ یہ لڑکی تم جیسے مُردہ دل آدمی سے بھی یہ جُرم کرا سکتی ہے۔ اب میری بات غور سے سُنو اور دماغ سے انسپکٹری نکال دو۔ مجھے ساہوکار کے قتل کی اطلاع ملی۔ میں موقعہ واردات پر گیا۔ آدھی سے زیادہ لاش گِدھ کھا چکے تھے۔ میں اسے رہزنوں کی واردات لکھ دینا چاہتا تھا لیکن ساہوکار کے بیٹوں کے ساتھ قصبے کے چار معزز ہندو آ گئے۔ انہوں نے زور دیا کہ تحقیقات گہری ہونی چاہئیے کیونکہ انہیں قتل کا شبہہ ہے۔ وہ مردود قتل ہی ہُوا تھا لیکن وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ مقتول کی بیوی نوجوان ہے جس کا باپ ساہوکار کا مقروض بھی ہے اس لیے انہیں شُبہہ ہے کہ ساہوکار کو بیوی نے قتل کرایا ہے ....

"میں نے جس جس پر شک ہُوا اُسے تھانے بٹھا لیا اور میں دوسرے دن ساہوکار کے گھر اس لڑکی کے بیان کے لیے گیا۔ میری عادتوں اور کرتوت سے تم واقف ہو تم نے لڑکی کو بھی دیکھ لیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں شکاری ہوں۔ بہت عورتیں دیکھی ہیں۔ کوئی لڑکی میرے جسم کے اندر داخل نہیں ہو سکی لیکن

اس لڑکی نے مجھے یوں سمجھو کہ حراست میں لے لیا۔ ایسا بانکپن کبھی نہیں دیکھا میں تفتیش کے تمام کرتب بھول گیا۔ ساہوکار کے دونوں بیٹے اصل بدھوا اور بزدل نکلے۔ میں نے لڑکی کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ قتل میں اس کا ہاتھ ہے۔ پہلے روز اسے الگ کمرے میں بٹھایا تو میں نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ سیدھا کہا — ”اس جوانی اور اس حُسن پر رحم کرو اور اسے جیل خانے میں گلنے سڑنے سے بچا لو۔ صاف بتا دو کہ تم نے خاوند کو کس سے قتل کرایا ہے، میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا۔“....

”لڑکی بہت ہوشیار ہے اور اس کے سینے میں مردوں کا دل ہے۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے گاؤں سے شہادت جمع کر چکا ہوں۔ بہت دیر لگی۔ میں اسے تھانے لے گیا۔ تفتیش کے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ تم جانتے ہو کہ اس کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ آدھی رات کے بعد لڑکی موم ہو گئی لیکن ملک! میں سچ بتا دوں کہ میں پہلے ہی موم ہو چکا تھا۔ میں اس لڑکی کے ساتھ دو چار روز کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی ملکیت میں رکھنے کا عہد کر لیا۔ اسے تم محبت کہہ لو، میری بیوقوفی کہہ لو، پاگل پن کہہ لو۔ میں نے اس لڑکی کو اُن عورتوں سے اونچا درجہ دیا جو میری زندگی سے گزر چکی تھیں۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ ساہوکار کو اس نے اُس آدمی کے ہاتھوں قتل کرایا ہے جسے تم نے حوالات میں بند کیا ہے۔ لڑکی نے اس آدمی کو اپنی نوکرانی کے ذریعے پیغام بھیجا تھا کہ ساہوکار فلاں دن فلاں گاؤں میں وصولی کے لیے جا رہا ہے....

اس عشقِ خانہ خراب نے....

”قتل کے بعد لڑکی اور اس آدمی کا پروگرام یہ تھا کہ کہیں دُور بھاگ جائیں گے اور شادی کر لیں گے۔ ان دونوں بدبختوں کو بھاگ کر کہیں دُور ہی چلے جانا تھا تو وہ ساہوکار کو قتل کیے بغیر بھی بھاگ سکتے تھے۔ قتل کرنے کی انہیں ضرورت یہ پیش آئی تھی کہ لڑکی کے دل میں ساہوکار کی اتنی نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ اُسے دیکھ کر اس پر باؤلا پن طاری ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کو پاگل ہوئی جا رہی تھی اور جو آدمی اس لڑکی کا متوالا تھا وہ جوانی کے جوش میں آ کر ساہوکار کو قتل کر بیٹھا۔ قتل کامیاب تھا۔ میں نے لاش اور مقام دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ ساہوکار کو لُوٹا اور قتل کیا گیا ہے اور یہ رہزنوں کا کام ہے مگر لڑکی میرے جال میں آ گئی اور بھاگ نہ سکی....

”لڑکی نے عجیب جذباتی لہجے میں مجھے کہا — ”میں نے آپ کے اس وعدے پر آپ کو دل کا بھید بتا دیا ہے کہ آپ میری جوانی اور میری خوبصورتی کو جیل میں گلنے سڑنے سے بچا لیں گے۔ میں نے سُنا ہے مسلمان زبان اور آن کے پکے ہوتے ہیں۔ کیا آپ اپنا وعدہ پُورا کریں گے؟“ — میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اپنا وعدہ ہر قیمت پر پُورا کروں گا لیکن قاتل کو ضرور پکڑ دوں گا“ — اُس نے کہا — ”یہ کوئی بات نہ بنی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرے خاوند کو ڈاکوؤں نے لُوٹا اور مار ڈالا ہے؟“....

"میں نے اسے اس خطرے سے خبردار کیا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تو کہیں بھی اور کسی بھی وقت پکڑی جائے گی۔ اس آدمی کا باپ کھاتا پیتا زمیندار ہے۔ وہ اپنے جوان بیٹے کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دے گا۔ اگر نہ پکڑے گئے تو وہ کیا کرے گا؟ اَن پڑھ آدمی ہے۔ کسی زمیندار کا نوکر بن کر کھیتی باڑی کرے گا۔ اور جس زمیندار کی بھی نوکری کرے گا وہ لڑکی کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرے گا....

"اس طرح میں نے اس کے سامنے اس کے مستقبل کی ایسی بھیانک تصویر رکھی کہ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ لے۔ میں ہر طرح مدد کروں گا۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ میں ہی اسے پکڑ لوں گا....

"اب تم مجھے کہو گے کہ میں نے لڑکی کو حوالات میں کیوں نہ بند کر دیا اور اس کا اقبالی بیان مجسٹریٹ سے ریکارڈ کیوں نہ کرا لیا؟ میں تمہیں جو جواب دوں گا اس سے تم خوش نہیں ہو گے۔ میں تفتیش کے قاعدے قانون بھول چکا تھا اور میں یہ بھی بھول چکا تھا کہ میں تھانیدار ہوں۔ یہ دیہاتی لڑکی، قتل کی ملزم، میرے ہاتھ میں کھلونا تھی۔ میں اسے تفریح کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ وہ میرے قدموں میں گری جا رہی تھی لیکن ملک! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے ذہن سے جس طرح تھانیداری نکل گئی تھی اسی طرح عیاشی بھی نکل گئی۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی تفتیش کے بند کمرے میں ہنس کھیل کر اسے چلتا کروں۔ تم نے اس لڑکی کو غور سے نہیں دیکھا۔ ایک بار پھر

دیکھنا۔ اس کے چہرے پر معصومیت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ دل لگا رکھا تھا لیکن اس کی حالت ایک پنچھی کی سی تھی جو پنجرہ توڑ کر اُڑ جانا چاہتا تھا۔"

اس واردات کو بہت مدت گزر گئی ہے لیکن مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تھانیدار میرے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ ڈیوٹی سے بے نیازی اور عیاشی کے لحاظ سے وہ شہزادہ تھا۔ کسی سے ڈرتا اور دبکتا نہیں تھا لیکن اس لڑکی کے متعلق باتیں کرتے مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ وہ نہیں کوئی اور ہے۔ ہنسی مذاق اور بدمعاشی کے موڈ میں رہنے والا یہ شخص جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کی زبان نہیں دل بول رہا تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اس کا لب و لہجہ اتنا اثر انگیز تھا کہ میں اس کے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ میں اُس لڑکی کو بھی دیکھ چکا تھا جس نے اس کی ذہنیت ہی بدل ڈالی تھی۔ لڑکی میں بلاشک و شبہ یہ اثر تھا جو ہمارے تھانیدار پر طاری ہو گیا تھا۔

بیٹی اپنے باپ کی نہیں تھی؟

"تم نے اس کی ماں کو اور باپ کو دیکھا ہے"— میں نے اس سے پوچھا— "کیا وہ اپنی بیٹی کے نقش و نگار اور رنگت کے ہیں؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا— "اس کا باپ سیاہ رنگ کا ہے

اور یہاں کے کسانوں کی طرح کا کسان۔ اس کی ماں کا رنگ اس جیسا گورا تو نہیں گندمی ہے اور اُس کے نقش و نگار اچھے ہیں۔ جوانی میں اس عورت میں خاصی کشش رہی ہوگی۔ اب بھی اُسے دیکھو تو اپنی قبیل سے مختلف اور الگ تھلگ لگتی ہے۔ مجھے یقین کی حد تک شک ہے کہ یہ لڑکی اس باپ کی بیٹی نہیں۔ اس کی دلیری اور ذہانت بتاتی ہے کہ اس کے دل اور دماغ میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ کسی مسلمان کا ہے اور یہ مسلمان کوئی عام قسم کا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ شاید یہ خون کی مطابقت تھی یا کشش کہ لڑکی نے اس مجبوری کی حالت میں بھی اپنے آپ کو میرے آگے رشوت کے طور پر پیش نہ کیا۔ تم جانتے ہو ملک! کوئی عورت جب جرم کر کے کسی تھانیدار کے چنگل میں آجاتی ہے تو وہ اپنی سب سے زیادہ قیمتی شے جسے عصمت کہتے ہیں پیش کر دیتی ہے۔ یہ تجربہ تمہیں کئی بار ہوا ہوگا، مگر اس لڑکی کے رویّے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ اپنی سطح سے نیچے نہیں گرے گی....

"میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کردار کی کیسی ہے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے دھیمی مگر پختہ آواز میں کہا — 'آپ کے اس ہاتھ کو میں اپنے ہاتھ سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی' — میں نے کہا — 'تم نے عمر قید کے لیے جیل جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟' — اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر کہا — 'اگر آپ سودا کر رہے ہیں تو میں پھانسی چڑھنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ مردوں کی طرح بات کریں۔ آپ تو بڑے کچے آدمی ہیں....

"میرے دل سے آواز اُٹھی کہ خان! اس لڑکی پر ثابت کر دو کہ تم مرد ہو۔ میں نے اس کے ساتھ بہت باتیں کیں۔ اس نے بھی کیں۔ آدھی رات کے بعد ہم ایک دوسرے کے دل میں اُتر گئے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اسے اس حد تک چاہتا ہوں کہ اس کے جسم کو اُس وقت اپنا سمجھوں گا جب میں اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لوں گا۔ ایسا اشارہ دراصل اسی نے دیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ میں نے جب اسے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ میں اب تفتیش کے بہانے اس کے گھر آیا کروں گا تو دو طرح کی سوچوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ایک یہ کہ یہ لڑکی مجھے بیوقوف بنا گئی ہے اور دوسری یہ کہ میں اس لڑکی سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں اتنی زیادہ قیمت دینے کے لیے تیار ہو گیا جتنی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا....

"اب تم میرے جرم سنو۔ تفتیش سے میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ قتل کی نشاندہی ہو جانے کے باوجود میں نے اُس کی گرفتاری کا کچھ بھی انتظام نہ کیا۔ مُجرا اپنی اپنی رپورٹیں لائے جو میں نے بددلی سے سُنیں اور انہیں کہا کہ آئندہ وہ اس واردات کے سلسلے میں کوئی بات تھانے میں کسی کے ساتھ نہ کریں، صرف میرے ساتھ واسطہ رکھیں۔ میں نے انہیں کوئی اور ہدایت نہ دی۔ اگر کوئی مجھے کہے کہ اس لڑکی نے مجھ پر تعویذ، ٹونے یا کالے علم کے ذریعے قبضہ کر لیا ہے تو میں اسے سچ مان لوں گا۔ میں دن کے وقت اس کے گھر گیا۔ مجھے شک تھا کہ یہ غائب ہو چکی ہوگی مگر وہاں موجود تھی۔ مُسکرا کر بولی — 'مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں' — میرے منہ سے نکل گیا — 'گرفتار ہو کر آیا ہوں'....

"ہم کمرے میں چلے گئے۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کر لیا تھا اور اس نے میرے جذبات کو بھی قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ واردات کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ میرے دل میں کوئی گندہ خیال بھی نہ آیا۔ مجھ پر نشے کا خمار طاری ہو گیا۔ اگر میری دلچسپی اس کے جسم کے ساتھ ہوتی تو میری جذباتی حالت یہ نہ ہوتی۔ میں لیلیٰ مجنوں کی قسم کی کہانیوں کا ہمیشہ مذاق اُڑاتا رہا ہوں۔ اب کہہ سکتا ہوں کہ ان میں صداقت تھی....

"میں ہر روز اس کے گھر چلا جاتا اور اس کے ساتھ کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ وہ بھی میری طرح دیوانہ سی ہو گئی تھی۔ ایک روز میں نے اس سے جذبات کی شدت میں پوچھا — 'تمہارا باپ تم سے بہت پیار کرتا ہو گا؟' — اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اُداس سے لہجے میں بولی — 'مجھے پیار ماں سے ملا ہے یا اب تم نے دیا ہے' — اس نے مجھے تم کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے لگی — 'باپ اگر مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا تو اُس نے مجھے کبھی پسند بھی نہیں کیا تھا۔ میں بچپن میں بہت شوخ ہُوا کرتی تھی۔ شرارتیں بہت کیا کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، باپ نے مجھے تین بار غصے سے کہا تھا — 'اوہ پلیچھ مسلمان کی اولاد! چپ کر اور چپ کرنے دے.... میں باپ کے پیار کو ترستی ہی رہی ہوں۔ ماں مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ گھر میں بھینس اور ایک دو بکریاں رہتی تھیں۔ مجھے باپ سے چوری بہت دودھ پلاتی تھی'....

'یہاں سے میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ کسی مسلمان کی اولاد ہے اور اس کا باپ اس حقیقت سے واقف ہے۔ میں نے اس سے اس آدمی کے

متعلق پُوچھا جس سے اس نے ساہوکار کو قتل کرایا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ 'تم مجھے بے وفا کہہ لو۔ میں سچ بتاتی ہوں کہ میری خاطر میرے خاوند کو قتل کرنے کے باوجود مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔ اسے میرے ساتھ جو لگاؤ تھا وہ تمہاری طرح کا نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ جو حرکتیں کی ہیں وہ تم آسانی سے کر سکتے تھے۔ میں تمہارے ہاتھ میں مجبور ہُوں۔ تمہاری قیدی ہوں۔ تم مجھے جیل خانے بھجوا سکتے ہو لیکن تم نے مجھے وہ محبت دی ہے جس کے لیے میرا دل ترستا تھا' — اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے سر میری گود میں پھینک دیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ پھر سر اُٹھا کر بولی — 'اگر مجھے دھوکہ دینا ہے تو فوراً دو۔ میں ناپاک ہوں۔ یہی سمجھوں گی کہ ایک اور ناپاک آدمی سے پالا پڑ گیا تھا۔ میرا بیان لکھ لو کہ میں نے اپنے خاوند کو قتل کرایا ہے۔ میں انگوٹھا لگا دوں گی'....

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ملک! تم میری جذباتی اور ذہنی حالت سمجھ گئے ہو۔ مجھ پر جذبات کا پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہندو شہری جو میرے پاس آئے تھے کہ میں پوری تحقیقات کروں گا کیونکہ انہیں شک تھا کہ ساہوکار کو بیوی نے قتل کرایا ہے، وہ دو تین بار مجھے ملے اور پوچھا کہ میری تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ میں انہیں تسلی دے کر ٹالتا رہا۔ وہ کمشنر تک پہنچنے کی باتیں کرتے تھے میرے دماغ پر لڑکی کا قبضہ تھا۔ اس کیفیت نے مجھے اس فیصلے پر پہنچایا کہ میں لڑکی کو لے کے کہیں چلا جاؤں۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں نے ساہوکار کے قاتل کو گرفتار کیا تو لڑکی کو بھی اعانتِ جرم میں گرفتار کرنا پڑے گا۔ یہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا تھا کہ اسے میں کہیں لے جاؤں گا۔ اس نے کہا تھا

کہ جہاں چاہو لے چلو۔ مسلمان ہو جاؤں گی۔ میں نے طے کر لیا کہ اسے کہیں لے جاؤں گا۔۔۔۔

تھانیدار اور لڑکی پکڑے گئے

"میں نے اُس روز وہسکی کی بوتل ساتھ لی اور روزمرہ کی طرح ساہو کار کے گھر چلا گیا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک بار پی کر اس کے گھر گیا تھا۔ اب پوری بوتل ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے پینے سے روکا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ شادی کر کے چھوڑ دوں گا۔ ایک نشہ اس لڑکی کا طاری تھا، اس کے ساتھ شراب پی لی۔ رہی سہی عقل بھی ماری گئی۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ ساہو کار کا منشی آگیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تھانے جاؤ اور دو ٹٹوؤں یا گھوڑوں کا فوراً انتظام کرو۔ وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد میں اکیلا تھانے گیا اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ میں لڑکی کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔ اس نے نشاندہی کی ہے۔ اتنے میں دو گھوڑے آگئے پھر میری ہدایت کے مطابق لڑکی تھانے آگئی۔ اسے۔ ایس۔ آئی کو میں نے یہ کہہ دیا کہ میں شام کے بعد جاؤں گا، وردی میں نہیں جاؤں گا اور میرے ساتھ کوئی کانسٹیبل نہیں جائے گا۔ شام کے بعد ایک گھوڑے پر لڑکی کو سوار کیا، دوسرے پر میں خود سوار ہوا اور ہم روانہ ہو گئے۔۔۔۔

"میں بہت دُور جا رہا تھا۔ رات کو میں ریل گاڑی سے جا سکتا تھا لیکن میں احتیاط کرنا چاہتا تھا کہ کوئی مجھے لڑکی کے ساتھ سٹیشن پر نہ دیکھ لے۔ لڑکی

نے بہت سی رقم اور زیورات مجھے دے دیئے تھے۔ شراب، لڑکی اور جذبات نے مجھ سے بڑا ہی دلیرانہ اور احمقانہ فیصلہ کرایا۔ میں ایک ملزمہ کے ساتھ پولیس کی نوکری سے بھگوڑا ہو رہا تھا۔ مجھے ڈیڑھ سو میل دُور اپنے ایک دوست کے پاس جانا تھا۔ وہ اثر و رسوخ والی حیثیت کا آدمی ہے۔ اس کی مدد سے مجھے چھُپے رہنا یا کہیں اور چلے جانا تھا۔ میں نے قصبے کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار ہونے کی بجائے پندرہ سولہ میل دُور کے سٹیشن سے گاڑی پکڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ تم اگر ان راستوں سے واقف ہو تو جانتے ہو گے کہ ریل گاڑی چکر کاٹ کر جاتی ہے۔ میں نے جنگل کے راستے سیدھا جانے کی سوچی۔ اس علاقے میں جانے سے میں یہ تاثر بھی دینا چاہتا تھا کہ میں لڑکی کے گاؤں جا رہا ہوں"۔

وہ مجھے اپنا پلان سُنا رہا تھا جو سراسر جاہلانہ تھا۔ اب جب کہ وہ زخمی حالت میں پڑا تھا وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اُس سے بہت بڑی لغزش سرزد ہوئی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لیتا تو لڑکی کو بچانے کا محفوظ راستہ نکال سکتا تھا۔ قاتل کو گرفتار کر کے لڑکی کے بغیر عدالت میں پیش کر سکتا تھا۔ قاتل بری ہو جاتا تو ہوتا رہتا۔ اس کے بعد تھانیدار لڑکی کو در پردہ کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتا۔ پھر اسے مسلمان کر کے شادی کر لیتا۔ تھانیدار بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بھی کر سکتا تھا مگر جیسا کہ میں نے شروع میں آپ کو بتایا ہے، یہ شخص احمقوں کی سی حرکتیں بھی کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ اس بنیاد پر ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے عادت کے مطابق بد اخلاقی نہیں کی بلکہ لڑکی کو اپنے دل میں پاکیزہ

درجہ دیا تھا۔

"ہم دونوں گھوڑوں پر سوار قصبے سے کم و بیش سات آٹھ میل دُور ویران علاقے میں جا رہے تھے جہاں چٹانیں اور نشیب و فراز زیادہ ہیں۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ میرے ذہن سے جہاں اور حقیقتیں نکل گئی تھیں وہاں میں اس خطرے سے بھی بے خبر ہو گیا تھا کہ اس علاقے میں ڈاکو اور رہزن بھی ہو سکتے ہیں۔ اچانک ہم پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ تب مجھے خطرے کا احساس ہُوا لیکن میں نے اپنے آپ کو یہ تسلی دی کہ ڈاکو اور رہزن رات کو جنگل میں تھوڑا ہی پھرتے رہتے ہیں۔ مجھے آواز سنائی دی "ٹھہرنا بھئی"— میں رُک گیا۔ ٹارچ کی روشنی مجھے کچھ دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھا تو آواز آئی "نہ نہ۔ ہاتھ پیچھے کر لو۔ چار بندوقوں کی نالیاں تمہاری طرف ہیں"— اس کے ساتھ ہی آواز آئی— "او ہو یہ تو ہمارے خان صاحب ہیں۔ آئیے داروغہ صاحب" میں اصلے ٹھگ کے گھیرے میں آ گیا تھا۔"

اصلا اس علاقے کا رہزن اور ڈکیت تھا۔ وہ اصلا ٹھگ کہلاتا تھا۔ اس کا پورا گروہ تھا۔ وہ کوئی نامور ڈاکو نہیں تھا۔ ایک دو بار پکڑا گیا اور سزا پا چکا تھا۔ علاقے کی دشواریوں کی وجہ سے اسے پکڑنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہ ڈاکو جنہیں ٹھگ بھی کہا جاتا تھا مُغلیہ خاندان کے آخری دَور میں زور پکڑ گئے تھے۔ انگریزوں کو بھی انہوں نے بہت پریشان کیا تھا۔ امیر علی ٹھگ اور سلطانہ ڈاکو ٹھگوں کے پیر استاد تھے۔ انگریزوں نے ان کے متعلق کتابیں بھی لکھی تھیں۔ یہ لوگ ایک

طاقت بن گئے تھے۔ ان کے خلاف اکثر فوج استعمال کی جاتی تھی۔ مسلسل معرکہ آرائی سے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر جب تک میں وسطی اور شمالی ہندوستان میں رہا رہزنوں کے گروہ موجود رہے۔ اب بھی موجود ہیں اور سرگرم رہتے ہیں۔

ہمارا تھانیدار اصلے ٹھگ کے گھیرے میں آ گیا۔ وہ آٹھ دس آدمی تھے۔ اصلا اُن کے ساتھ تھا۔ وہ کہیں سے آ رہے تھے اور اپنے ٹھکانے کو واپس جا رہے تھے۔ انہیں تھانیدار اور لڑکی مل گئے۔ یہ اُن کے لیے بڑا ہی قیمتی شکار تھا۔ لڑکی کی قیمت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ تھانیدار کو وہ یرغمال کے طور پر رکھ کر حکومت سے منہ مانگی رقم لے سکتے تھے۔ ریوالور تھا، دو گھوڑے تھے اور تھانیدار کے پاس رقم اور زیورات تھے۔ تھانیدار کو اصلے نے پہچان لیا۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ لڑکی کو میرے ساتھ جانے دو باقی جو کچھ ہے لے لو مگر اصلا نہ مانا۔

"خان صاحب!"— اصلے نے کہا— "آپ اور لڑکی ہی تو ہماری دولت ہیں۔ گھوڑے ہمارے کس کام کے"۔

واقعی چار بندوقوں کی نالیاں تھانیدار کی طرف تھیں۔ اس کا پستول لے لیا گیا اور اس سے رقم اور زیورات بھی لے لیے گئے اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لے چلے۔

اصلا اور اس کے آدمی پیدل جا رہے تھے۔ تھانیدار اور لڑکی کو انہوں نے گھوڑوں پر سوار رہنے دیا اور انہیں اپنے ساتھ لے چلے۔ تھانیدار کا نشہ اُتر گیا۔ اسے اپنی لغزش کا احساس ہُوا۔ وہ بہت دلیر آدمی تھا مگر اکیلا اور نہتہ تھا۔ لڑکی کے متعلق اس نے سوچ لیا تھا کہ جیتے جی اصلے ٹھگ کے پاس

نہیں جانے دے گا۔ اس نے اصلے سے سودے بازی کرنا چاہی۔ وہ زمیندار خاندان کا فرد تھا۔ اس نے اصلے کو رقم پیش کی۔

"خان صاحب!" — اصلے نے ہنس کر کہا — "میں آپ کا نقصان نہیں کروں گا۔ انگریز بادشاہ سے آپ کی قیمت لے کر آپ کو رہا کر دوں گا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ جا کہاں رہے تھے؟"

تھانیدار نے لڑکی کو اپنی بیوی بتایا اور کوئی جھوٹ بولا۔ اس نے اصلے سے یہ بھی کہا کہ میرے علاقے میں واردات کرو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ نہیں پکڑوں گا۔ اصلا اتنا کچا نہیں تھا، نہ مانا۔

تھانیدار گھوڑے سے اُتر کر اصلے کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور اس کی مروانگی کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اُسے کہا — "تم اتنے زیادہ آدمی ہو اور میں اکیلا ہوں۔ اگر تم نے میرے جیتے جاگتے میری بیوی پر ہاتھ ڈالا تو میں سمجھوں گا کہ اصلا اپنے باپ کا نہیں تھا اور بدبخت ہیجڑہ تھا" — اصلے نے اسے کہا — "جب تک میرے پاس ہو تمہاری بیوی تمہارے پاس رہے گی۔ اگر مجھے تمہارے عوض رقم مل گئی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہاری بیوی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اس سے تھانیدار کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اسے فرار کا موقع پیدا کرنے کے لیے وقت مل جائے گا۔ رات کا آخری پہر تھا جب یہ گروہ ایک جگہ رُکا۔ اردگرد چٹانیں اور درخت تھے۔ وہیں کہیں کچا سا ایک مکان تھا جس میں تھانیدار اور لڑکی کو بند کر دیا گیا۔ کمرے کی کوئی کھڑکی اور روشندان نہیں تھا۔ صرف ایک

دروازہ تھا جو باہر سے بند کر دیا گیا۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ اس پر کمبل اور چادریں بچھا دی گئیں۔ دونوں سو گئے۔ تھانیدار کی جب آنکھ کھلی تو دروازے کی درزوں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ ایک آدمی نے انہیں کھانا دیا۔ اُس کا سر اور چہرہ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ تھانیدار نے اُس کے ساتھ باتیں کیں لیکن وہ خاموش رہا اور چلا گیا۔

قید، سلاخ اور ایک فوجی

وہ تین چار روز اس کمرے میں بند رہے۔ لڑکی نے تھانیدار سے کہا — "اگر میرے بدلے یہ لوگ تمہیں چھوڑ دیں تو میں تمہارے لیے یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ بھگت لوں گی۔"

تھانیدار نے اسے کہا — "مروں گا تو تمہیں ساتھ لے کر مروں گا، نکلوں گا تو تمہیں ساتھ لے کے نکلوں گا۔ مجھے صرف تمہارا غم ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ یہ تیسرا دن تھا یا چوتھا" — تھانیدار نے مجھے سنایا — "مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ باہر رات ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہمارے لیے کھانا آیا تھا۔ کھانا لانے والے کا چہرہ بدستور کپڑے میں ڈھکا ہوا تھا۔ اُس نے کھانا ہمارے آگے رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ قمیض کے اندر سے اُس نے تقریباً دو فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی لوہے کی سلاخ نکالی۔ اس کا ایک سرا پیچ کس کی طرح تھا۔ اس آدمی نے سلاخ میرے قریب خشک گھاس کے نیچے

چھپا دی اور آہستہ سے کہا — "یہ دیوار پچھواڑے کی ہے۔ دیوار پتھروں کی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس سلاخ سے پتھر نکال لینا۔ آواز نہ نکلے۔ پتھر آسانی سے نکل آئیں گے۔ تین چار پتھر نکلے تو تم دونوں بڑے آرام سے اس سوراخ میں سے نکل جاؤ گے۔ آج یہاں آدمی تھوڑے ہیں۔ وہ اس طرف دروازے کی طرف سوئے ہوئے ہوں گے۔ آواز نہ نکالنا"...

"وہ مجھے نقب لگانے کو کہہ رہا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہ کام ماہر نقب زن آواز نکالے بغیر بڑی تیزی سے کر لیا کرتے ہیں لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ میرا کونسا ہمدرد ہے؟ مجھے شک ہوا کہ یہ مجھے قتل کرنے کا بہانہ پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اُس نے کہا۔ 'میں آپ کا ایک احسان مند ہوں۔ آپ نکل جائیں۔ میں احسان کا بدلہ دینا چاہتا ہوں'۔ میرے اصرار پر اُس نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ کوئی ایک سال ہوا میں دوسرے تھانے میں تھا۔ ایک بھگوڑے فوجی کی گرفتاری کے کاغذات آئے۔ وہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے ایک رات اس کے گھر چھاپہ مارا اور اُسے پکڑ لیا۔ وہ مسلمان ہے۔ اُس کے باپ نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ یہ فوجی اُس کا اکیلا بیٹا تھا۔ باقی دو لڑکیاں تھا۔ یہ اکلوتا بیٹا گھر سے بھاگ کر بھرتی ہو گیا تھا۔ اُسے فرنٹ پر بھیجا گیا تو راستے سے بھاگ آیا۔ اس کی ماں اور بہنیں بہت روئیں۔ ماں نے دوپٹہ اتار کر میرے پاؤں میں رکھ دیا۔"

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بعض بھگوڑے فوجی اپنے تھانے کے تھانیداروں کو ماہوار رشوت دیتے اور گرفتاری سے بچے رہتے تھے۔ یہ تھانیدار ایسے تین فوجیوں سے رشوت لے رہا تھا۔ یہ چوتھا فوجی آگیا مگر وہ باقاعدہ رشوت دینے

کے قابل نہیں تھا۔ تھانیدار نے اُس کی غربت کو دیکھتے ہوئے اور اُس کی ماں اور بہنوں کی فریادوں سے متاثر ہو کر اور یہ خیال کر کے بھی کہ وہ مسلمان ہے، اسے گرفتار نہ کیا۔ اس نے چوکیدار اور نمبردار سے بھی کہہ دیا کہ اس جوان پر پردہ ڈالے رکھیں۔ اس نے گرفتاری کے حکم نامے کا جواب دیا کہ بھگوڑا ابھی مفرور ہے، گرفتاری کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ چھ سات مہینے بعد تھانیدار کو اس تھانے میں بھیج دیا گیا جہاں وہ اب تھا۔ اتنا عرصہ اس نے بھگوڑے کو گرفتار نہ کیا۔

"اب ایک سال بعد وہی فوجی میرے سامنے بیٹھا تھا" — تھانیدار نے مجھے سنایا — "اس نے بتایا کہ دوسرے تھانیدار نے آتے ہی اسے گرفتار کر لیا اور اتنی زیادہ رشوت مانگی جو وہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن ایک ہیڈ کانسٹیبل اس کے گھر چلا گیا۔ اس سے ماہوار رشوت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو ٹالا اور گھر سے جنگل کو بھاگ گیا۔ ایک روز اتفاق سے اصلے کے دو آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اُسے اصلے کے پاس لے گئے۔ اسے رہزنی کی ٹریننگ دی گئی اور جرائم کے کچھ اور ڈھنگ بھی سکھائے گئے۔ اس نے بخوشی یہ پیشہ قبول کر لیا۔ میری خوش نصیبی دیکھو کہ وہ اس گروہ میں تھا جس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ اسے اُس رات میرے پاس آنے کا موقعہ ملا۔ میری نیکی میرے کام آئی۔ اس نے مجھے راستہ سمجھا دیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اصلا میرے متعلق فیصلہ نہیں کر سکا کہ میرے عوض حکومت سے رقم مانگے یا مجھے قتل کر دیا جائے۔ وہ گرفتاری سے ڈرتا ہے۔ شاید مجھے قتل کر دیا جائے گا....

یہ فوجی یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ میری اور کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مدد کرتا پکڑا گیا تو اسے اصلاً سزائے موت دے گا۔ اس نے میری بہت زیادہ مدد کی تھی۔ میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ دیا بجھا دیا جو کمرے میں جلتا رہتا تھا۔ اندھیرے میں سلاخ اُٹھائی اور دیوار کے پاس بیٹھ کر دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ یہ بے قاعدہ پتھروں کی دیوار تھی۔ اُوپر مٹی کا لیپ تھا۔ میں نے لیپ اکھاڑ کر ہاتھ سے ٹٹولا اور دو پتھروں کے درمیان سلاخ کا سرا رکھ کر زور لگایا۔ کوشش کے بعد دو پتھر ہلنے لگے۔ پابندی یہ تھی کہ آواز نہ نکلے ورنہ یہ پتھر نکالنے مشکل نہیں تھے۔ ایک پتھر باہر آ گیا۔ اب کوئی مشکل نہیں تھی۔ میں نے فرش تک چار پانچ پتھر نکال لیے۔ یہ سیمنٹ سے نہیں مٹی سے جُڑے ہُوئے تھے۔ پھر اتنا سوراخ ہو گیا کہ اس میں سے رینگ کر نکلا جا سکتا تھا....

لڑکی کو بچانا مشکل تھا

"میں نے سلاخ ہاتھ میں رکھی اور پیٹ کے بل باہر نکل گیا۔ میں اُٹھا ہی تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک لاٹھی میرے کندھے پر پڑی۔ میں نے یہ ضرب سہہ لی اور سلاخ سے جوابی وار کیا۔ سلاخ اُس کے سر پر پڑی۔ گرتے گرتے اُس نے اپنے ساتھیوں کو پکارا۔ اس کے بعد اُس کی آواز نہ نکلی۔ اگر لڑکی ساتھ نہ ہوتی تو میں دَوڑ پڑتا۔ لڑکی سوراخ سے نکل رہی تھی۔ اُدھر سے آدمی دوڑتے آ رہے تھے۔ میں نے لڑکی کا بازُو پکڑ کر اُٹھایا اور اسے کہا

کہ میرے ساتھ رہے۔ وہ شاید چار تھے۔ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک کے پاس برچھی تھی۔ مجھے زیادہ زخم برچھی کے آئے ہیں لیکن گہرا کوئی نہیں۔ سلاخ نے بہت کام دیا۔ لڑکی کو میں نے بائیں بازو کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اسے بھی دو زخم آئے ہیں لیکن معمولی ہیں۔ دوسروں کے پاس ڈنڈے اور شاید چاقو بھی تھے....

"میں اپنے قید خانے سے دُور ہٹتا جا رہا تھا اور مقابلہ بھی کر رہا تھا۔ لڑکی نے جھک کر دو پتھر اُٹھا لیے اور تاک تاک کر مارے۔ شاید پتھر ایک دو کے منہ پر لگے تھے۔ ان میں سے صرف ایک رہ گیا اور میں لڑکی کو ساتھ لیے بھاگ اُٹھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں آیا۔ وہ سلاخ اس پلنگ کے نیچے پڑی ہے۔ زخموں سے خُون بہ رہا تھا۔ میں چلتا رہا۔ بہت دُور آ کر لڑکی کا دوپٹہ پھاڑ کر جہاں جہاں باندھا جا سکتا تھا باندھا اور چل پڑا....

"میری رفتار کم ہونے لگی۔ جسم بے حال ہو گیا۔ کچھ دُور تک لڑکی نے سہارا دیا۔ یہ مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ ذرّہ بھر نہ گھبرائی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ چل نہیں سکتے تو میں تمہیں پیٹھ پر اُٹھا لیتی ہُوں۔ میں نے رُوح کی بھی قوت صرف کر ڈالی اور چلتا رہا۔ سحر کے وقت یہ پہلا گاؤں راستے میں آیا۔ ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور ایک آدمی کو جگا لائے جس نے زخموں پر کوراسُوت جلا کر راکھ رکھی اور اُوپر دیسی شراب میں کپڑے بھگو کر باندھ دیئے....

"اب ملک! مجھے یہ بتاؤ میں کیا کروں۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو بلایا تھا مگر یہ ڈر بھی تھا کہ ہندو ہے اس لیے دھوکہ دے گا۔ اُس کی جگہ تم

آ گئے۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہے لیکن میں یہ بتا دوں کہ میں اس لڑکی سے دست بردار نہیں ہوں گا اور اسے قتل کی اس واردات میں شامل نہیں ہونے دوں گا، خواہ مجھے ایک بار پھر بھاگنا پڑے۔ یہ میرے لیے اب صرف لڑکی نہیں ہے۔ یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اسے اب مسلمان سمجھو۔ اس پر جو ظلم ہوا ہے وہ دیکھو۔ کس مردود کے ساتھ اسے بیاہ دیا گیا تھا۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تم نے قاتل کو پکڑ لیا ہے" — اس نے جواب دیا۔ "اس سے صورت بدل گئی ہے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ یہ بیان دوں گا کہ لڑکی کی نشاندہی پر میں اس کے گاؤں جا رہا تھا۔ راستے میں رات ہو گئی اور میں اصلے کے گھر سے میں آ گیا۔ اصلے سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا فی الحال اپنی حفاظت کا انتظام کرنا ہے۔ مجھ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ میں اکیلا کیوں گاؤں کو چل پڑا تھا۔ اس کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ میں کسی کو خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اکیلا گیا اور خاموشی سے گیا اور رات کو گیا۔"

"لڑکی کی نشاندہی کیا بتاؤ گے؟"

"یہی ملزم جسے تم نے پکڑ لیا ہے" — اس نے جواب دیا۔ "میں لڑکی سے یہ بیان دلواؤں گا کہ یہ آدمی اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا کہ ساہوکار کے گھر سے بھاگ چلو۔ شادی سے پہلے بھی پریشان کرتا رہتا تھا۔ چونکہ وہ امیر کبیر زمیندار کا بیٹا ہے اس لیے لڑکی اسے دھتکارنے سے ڈرتی تھی۔ اس آدمی نے ساہوکار کو قتل کر کے لڑکی سے کہا کہ چلو اس کے ساتھ۔ وہ لڑکی کو بھی قتل کر دینے کی دھمکیاں

دیتا تھا" — اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ "خدا کے بندے، تم بھی کچھ بولو۔ کیا تم انگریزی حکومت سے وفاداری کرو گے یا ایک مظلوم لڑکی کی عزت بچانے کی کوشش کرو گے جو اسلام قبول کر رہی ہے؟"

"میں تمہیں کوئی راستہ نکال دوں گا" — میں نے اُسے اُسی بے تکلفی سے کہا جس بے تکلفی سے وہ میرے ساتھ بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا — "لیکن تم ایسے حرامی ہو کہ اس لڑکی کو مسلمان بھی کر لو گے، اس کے ساتھ شادی بھی کر لو گے مگر تھوڑے سے عرصے میں تمہارے آج کے جذبات شراب اور بدکاری میں ڈوب جائیں گے۔ اگر تم مجھ سے لڑکی کے لیے ہمدردی چاہتے ہو تو مجھے یقین دلاؤ کہ تم ہمیشہ اس کے وفادار رہو گے۔"

"تم شاید نہیں سمجھ سکتے کہ اس لڑکی کی محبت میری روح میں اُتر گئی ہے" — اس نے کہا۔ "اور اصلے ٹھگ نے مجھے انسان بنا دیا ہے۔ میں حرامی پن چھوڑ چکا ہوں۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم اگر ہیرا پھیری پر اُتر آؤ تو تم پورے چکر باز ہو، میری مدد کرو۔"

میں نے مدد کا وعدہ کر دیا۔

میں نے جھوٹ کا جال بچھایا

لڑکی کو بلا کر اسے اچھی طرح بتایا کہ وہ کیا بیان دے گی۔ اسے قاتل کے خلاف بیان دینے تھے۔ اس پر بھی وہ آمادہ ہو گئی۔ میں نے اپنے طور پر

لڑکی کا گہرا جائزہ لیا۔ اسے بولنے کا موقعہ دیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکی دھوکہ باز تو نہیں۔ مجھے ایسا کوئی اشارہ نہ ملا۔ اس کے دل میں ساہوکار کے خلاف جو نفرت تھی وہ اُسے قتل کرانے کے بھی نہیں نکلی تھی۔ اس نے قتل سے پہلے ساہوکار سے اپنے باپ کا سارا سُود اور آدھا قرض معاف کرالیا تھا لیکن اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف بھی نفرت تھی۔ وہ اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اُس روز یہ نفرت اور زیادہ گہری ہوگئی تھی جس روز باپ نے اسے اتنے بوڑھے اور ایسے بھدّے جسم کے ساہوکار کے ساتھ صرف اتنے سے لالچ سے بیاہ دیا تھا کہ ساہوکار نے تھوڑا سا سُود معاف کر دیا تھا۔

لڑکی کی ان باتوں سے مجھے شک ہُوا کہ اس کا باپ جو اتنی پیاری بیٹی سے پیار نہیں کرتا تھا اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ بچپن میں اُس نے لڑکی سے کئی بار کہا تھا ــــ "اوئے ملیچھ مسلمان کی اولاد" ــــ اور اُس نے لڑکی کو اس ساہوکار کے حوالے کر کے اس عداوت کی تسکین کی تھی جو اس کے دِل میں لڑکی کے خلاف تھی۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ جب اس کے باپ نے اس ظالمانہ شادی کا فیصلہ کیا تو لڑکی کی ماں بہت روئی تھی مگر باپ نے پروا نہیں کی تھی۔ میں نے ہر مذہب اور مختلف علاقوں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ ہندو لڑکی کا انداز کچھ اور ہوتا ہے لیکن یہ لڑکی ہندوؤں سے بہت مختلف تھی۔ اس کی باتوں میں پختگی اور ذہانت تھی۔ بات سنتی تھی اور فوراً "اچھا جی" نہیں کہتی تھی۔ اپنی رائے دیتی اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی تھی۔ اس نے میری باتیں سمجھ لیں۔ مجھ سے کچھ سوال پوچھے اور معاملہ طے ہوگیا۔

تھانیدار کو بھی میں نے ایک راستہ بتا دیا۔ دراصل میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ مجھے اس تھانیدار کو برآمد کرنا تھا اور برآمدگی کے بعد کارروائی میں شہادت دینی تھی لیکن مسئلہ ایسا پیدا ہوگیا کہ میں نے اپنی ڈیوٹی لمبی کرلی۔ قتل کی واردات کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کیس میں میری حیثیت ایک گواہ کی بن گئی تھی کیونکہ میں نے قاتل کو پکڑا تھا۔ نازک مسئلہ نوکرانی کا تھا۔ اسے گواہ کے طور پر پیش کرنا ضروری تھا لیکن اب اس سے یہ نہیں کہلوانا تھا کہ وہ لڑکی کے پیغام ملزم تک پہنچاتی تھی۔ اسے اب کسی اور طریقے سے استعمال کرنا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس سے ملزم کو فائدہ نہ پہنچ سکے۔

سوچ سوچ کر میں نے تھانیدار سے کہا تھا کہ وہ اس پر زیادہ توجہ نہ دے کہ ملزم کو ضرور سزا ہو۔ بری ہو جاتا ہے تو ہونے دو۔ کوشش یہ کرنی تھی کہ تھانیدار کے خلاف کوئی شوشہ نہ نکل آئے۔ ہم نے اسے۔ ایس۔ آئی کو بھی اندھیرے میں رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

رات وہیں گزاری۔ سورج نکلنے سے پہلے ہم تھانیدار اور لڑکی کو ایک پالکی میں بٹھا کر روانہ ہُوئے۔ پالکی اٹھانے والے گاؤں کے آدمی تھے۔ شہر پہنچتے ہی دونوں کو ہسپتال میں لے گئے۔ لڑکی کے دونوں کندھوں پر برچھیوں کے زخم تھے جو گہرے نہیں تھے۔ کھال کٹ گئی تھی۔ میں تھانے گیا اور پہلا کام یہ کیا کہ ایک کانسٹیبل کو لڑکی کے گاؤں بھیجا کہ لڑکی کی ماں اور اس کے باپ کو بلا لائے۔ میں ملزم کو حوالات سے نکال کر تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ یہ دراصل میرا کام نہیں تھا لیکن میں نے اس دھاندلی کو جائز سمجھا۔ ملزم کی ذہنی حالت بہت

بُری تھی۔ قتل کے الزام میں پکڑے جانا بجائے خود بہت بڑی چوٹ تھی جس نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ ان ملزموں نے پوری کر دی تھی جو حوالات میں بند تھے۔ میرے کہنے پر وہ اسے ڈراتے رہے تھے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے ذرا پیار سے بات کی تو وہ رو پڑا۔

میں نے پیار اور شفقت کا رویہ اختیار کیا۔ اسے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی جو میں نے دے دیا اور وہ میرے اشاروں پر ناچنے لگا۔ اس نے اقبالی بیان دینے ذرا دیر نہ لگائی۔ یہ بالکل وہی کہانی ہے جو میں آپ کو دوسروں کی زبانی سُنا چکا ہوں مگر اس میں لڑکی اور نوکرانی کا رول ہمارے ڈرامے کے لیے خطرناک تھا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ لڑکی کو اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ اس کی خاطر اُس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اور لڑکی اس پر قربان ہونے کو تیار ہے۔ میں نے اس کے جذبات کو بھڑکا کر کہا کہ یہ مردانگی نہیں کہ وہ اپنے ساتھ لڑکی کو بھی عدالت میں خراب کرتا پھرے۔ یہ جذباتی دیہاتی مان گیا۔ اُس نے مجھ سے پُوچھا کہ وہ کیا بیان دے۔ میں نے اسے بتا دیا۔ اس کا بیان مکمل کر کے اسے مجسٹریٹ کے سامنے دفعہ ۱۶۴ کے تحت بیان دینے کے لیے تیار کیا۔

اس کی گرفتاری ساہوکار کے گھر کی رکھی۔ نوکرانی کو میں نے جو بیان یاد کرایا اس میں اس پر زور دیا کہ ملزم ساہوکار کے گھر میں داخل ہُوا۔ نوکرانی گھر میں اکیلی تھی۔ ملزم نے للکار کر پوچھا کہ لڑکی کہاں ہے۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔

نوکرانی نے ملزم کو ایک کمرے میں یہ کہہ کر بٹھا دیا کہ وہ لڑکی کو بلانے جا رہی ہے۔ لڑکی کی بجائے وہ پولیس کو بلا لائی۔ ملزم نے پولیس کو دیکھ کر نوکرانی پر حملہ کیا مگر اسے ہتھکڑی لگا لی گئی۔

یہ میں نے آپ کو نہایت مختصر سنایا ہے کہ میں نے شہادت کو کیا رنگ دیا۔ اس میں بہت باریکیاں اور کئی نازک پہلو تھے جو میں اس لیے نہیں سُنا رہا کہ بہت طویل ہیں۔ آپ دل چسپی کھو بیٹھیں گے۔ مختصر یہ کہ میں نے دو دنوں میں شہادت تیار کر دی۔ ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ میں نے کیس پر جھوٹ کا رنگ چڑھا کر ناجائز حرکت کی تھی۔ میں نے یہ حرکت ضروری سمجھی تھی۔ ایک مظلوم لڑکی کا مستقبل سنوارنے کے لیے مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا۔ ساہوکار کے قتل کا مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ آپ نہیں جانتے کہ ہندوستان میں ہندو میرے ساتھ کیسا بُرا سلوک کرتے رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ میں مسلمان تھا۔ اپنی بعض کہانیوں میں ان کے سلوک کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں ان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مُسلمان لڑکی کا قبولِ اسلام

شام سے بہت پہلے لڑکی کا باپ اور ماں آ گئی۔ میں نے باپ کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ وہ قتل کے الزام میں پکڑا جائے گا۔ بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں جو بیان بتاؤں وہ یاد کر لو اور عدالت میں یہی بیان دینا۔ غریب سا کسان رضامند

ہو گیا۔

لڑکی کی ماں کے بیان کو میں نے غیر ضروری سمجھا پھر بھی ایک دو باتیں سمجھانے کے لیے اسے الگ بٹھا لیا۔ یہ عورت ایک اور کہانی کی کردار نکلی۔ لڑکی کا باپ رنگ اور نقش و نگار کے لحاظ سے اسی علاقے کی صحیح نمائندگی کرتا تھا، لڑکی کی ماں کے نقش بڑے اچھے تھے اور رنگ گندمی۔ جوانی کی خوبصورتی بھی اس میں موجود تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے بہت روتی تھی میں نے اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ شفقت کی۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ وہ اپنے خاوند کو کوستی تھی جس نے اس کی بیٹی کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ تمہارا خاوند اپنی بیٹی کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، کیا وجہ ہے؟

"وہ کہتا ہے یہ اس کی بیٹی نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

"اور کس کی ہے"؟ — میں نے پوچھا۔

اس وقت تک میں اسے اپنے ساتھ خاصا بے تکلف کر چکا تھا۔ میرے سوال کا اس نے جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو یہ شک مجھے بھی ہے کہ یہ بیٹی تمہارے خاوند کی نہیں"۔ — میں نے کہا — "تم غم نہ کرو۔ تمہاری بیٹی کو میں صاف بچا لوں گا اور اس کی زندگی سنوار دوں گا"۔

"میرا خاوند ٹھیک کہتا ہے"۔ — اس نے کہا — "یہ لڑکی اس کی بیٹی نہیں"۔ — اُس نے شمالی ہندوستان کے ایک دُور کے علاقے کا نام لے کر کہا — "وہاں میری شادی ہوئے دو چار روز گزرے تھے ہم بہت غریب لوگ تھے۔

جنگل میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ وہاں شکاری آیا کرتے تھے بعض اپنے ساتھ خیمے لاتے تھے اور بعض ڈاک بنگلے میں رہتے تھے۔ ایک شکاری آیا۔ مسلمان تھا۔ بہت خوبصورت جوان تھا۔ اُس نے جنگل میں مجھے دیکھ لیا۔ اس نے میرے ساتھ زبردستی نہیں کی۔ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ بڑی پیاری باتیں کرتا رہا اور چلا گیا۔ میں اُسے دل میں یاد کرتی رہی۔ میں نے اتنا خوبصورت جوان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چھ سات روز بعد پھر آیا۔ اب میں جان بوجھ کر اس کے راستے میں آئی.... اور میں اپنی خواہش اور پسند کا شکار ہو گئی....

"لڑکی پیدا ہُوئی تو اس کا رنگ اور نقش اپنے باپ کے تھے۔ میرے خاوند نے صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی اولاد نہیں، اور اس نے یہ بھی کہا — "میں نے تمہیں اُس (شکاری) کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ تم اُجرت کے لیے اُس کا کوئی کام کر رہی ہو" — وہ مجھے وہاں سے لے آیا اور جگہ جگہ خراب ہوتے ہم اس گاؤں میں آ گئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ یہ وجہ تھی کہ میرے خاوند نے اس لڑکی سے کبھی پیار نہ کیا اور یہ جوان ہُوئی تو ذرا سے لالچ میں اس ساہوکار کے حوالے کر دی"۔

مجھے اپنے تھانے میں واپس جانا تھا۔ میں نے تھانیدار کی برآمدگی کی رپورٹ تیار کی اور اپنے ہیڈ کوارٹر کو چلا گیا۔ تھانیدار ہسپتال سے فارغ ہُوا تو قتل کا کیس عدالت میں گیا۔ تھانیدار نے لڑکی کو ساہوکار کے گھر رکھا اور ساہوکار کے بیٹوں کو ڈرایا کہ وہ اسے گاؤں نہ بھیجیں ورنہ پکڑے جائیں گے۔ مجسٹریٹ نے کیس سیشن سپرد کر دیا لیکن صفائی کے وکیل نے گواہوں کے

بیانات میں تضاد واضح کر دیا تھا۔ عدالت میں جھوٹ کو سچ ثابت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے شک تھا کہ کیس کا یہی حشر ہوگا۔ وہی ہُوا۔ ملزم سیشن کورٹ سے بری ہوگیا۔

تھانیدار اور لڑکی کے اغوا کے بعد کی کارروائی الگ کہانی ہے۔ چھ ماہ بعد تھانیدار نے لڑکی کو غائب کرایا۔ ڈیڑھ دو سو میل دُور اپنے ایک دوست کے گھر پہنچایا۔ پھر خود گیا۔ لڑکی کو مسلمان کیا اور شادی کر لی۔ چار سال بعد دِلّی میں اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ کیس کے بعد یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں لڑکی کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان کا ایک بچّہ پیدا ہو چکا تھا۔

○○○

اس نے گناہ تو نہیں کیا

آج میں اپنی نہیں کسی اور تھانیدار کی تفتیش کی کہانی سناؤں گا۔ اُس کا نام خان باز گُل تھا۔ کوہاٹ کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس کی کہانی اس لیے سُنا رہا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ صرف احمد یار خان تفتیش کا ماسٹر تھا۔ پولیس کے محکمے میں ایک سے ایک "ننھے خان" تھا۔ اس واردات کا قصّہ پڑھ کر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کیسی کیسی وارداتیں ہوتی ہیں اور انسانی فطرت کیسے کیسے کرتب دکھایا کرتی ہے۔

میں اُن دنوں سب انسپکٹر ہُوا کرتا تھا۔ ابھی دوسری جنگِ عظیم شروع نہیں ہُوئی تھی۔ میں ایک مہینے کی چھُٹی گزار کر واپس جا رہا تھا میں راولپنڈی سے ریل گاڑی میں سوار ہُوا۔ خان باز گل بھی وہیں سے سوار ہُوا۔ وہ کوہاٹ سے چھُٹی کاٹ کر آ رہا تھا۔ راولپنڈی سے اُس نے گاڑی بدلی تھی۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ ہم ایک ہی ڈبّے میں سوار ہُوئے۔ اُن دنوں ریل گاڑیوں میں کوئی رَش نہیں ہُوا کرتا تھا۔ آدھی

گاڑی خالی ہوتی تھی۔ ہمسفر بڑے مزے سے گپ شپ لگاتے جاتے تھے۔

خان باز گل میرے پاس بیٹھا۔ تعارف ہُوا تو پتہ چلا کہ وہ بھی سب انسپکٹر ہے اور ضلع امرتسر کے کسی تھانے کا انچارج ہے۔ مجھے اس تھانے کا نام یاد نہیں رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں بھی سب انسپکٹر ہوں تو ہم فوراً دوست بن گئے۔ اُس نے اپنا ایک مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ میری کہانی سُن کر مجھے بتائیں کہ میں نے گناہ تو نہیں کیا؟

وہ جس تھانے میں تھا وہ سکھوں کا علاقہ تھا۔ ہماری جو نسلیں پاکستان میں پیدا ہوئی ہیں انہوں نے سکھوں کو صرف دیکھا ہوگا۔ اُن کی خصلتوں اور ان کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔ دیہاتی علاقے کے سکھ جنگلی اور وحشی ہُوا کرتے تھے۔ اب بھی اُن کی حالت ویسی ہی ہوگی۔ گھر میں عورتوں اور بہو بیٹیوں کے سامنے بات کرتے ہیں تو انتہائی فحش گالیاں بکتے ہیں۔ گالیوں کے بغیر وہ اپنی بات کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ یہی حال اُن کی عورتوں کا ہے۔ وہ شرم اور حیا کو تسلیم نہیں کرتے۔ جو لوگ سکھوں کو نہیں جانتے وہ شاید یقین نہ کریں کہ اگر ایک بھائی شادی کرے تو اُس کی دُلہن اُس کے تمام بھائیوں کی دُلہن ہوتی ہے۔ اس بے حیائی کو بھائی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ البتہ باہر کا کوئی آدمی کسی کی بیوی سے چھیڑ خانی کرے تو بات قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ سکھ جس طرح جسمانی لحاظ سے غلیظ ہوتے ہیں اسی طرح اُن کی عادتیں بھی بیہودہ ہوتی ہیں۔

خان باز گل نے ایک واردات اس طرح سُنائی کہ ایک روز اُس کے ایک مُخبر نے اُسے بتایا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر کوئی آدمی قتل ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ ایک عورت بھی قتل ہو جائے۔

میں آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار بتا چکا ہوں کہ ہر تھانے میں مخبر ہوتے ہیں جن میں سے بعض سرکاری یعنی باقاعدہ ملازم ہوتے ہیں اور بعض غیر سرکاری۔ اکثر تھانیدار بعض جرائم پیشہ آدمیوں کو اپنے اعتماد میں لیے رکھتے اور انہیں مخبری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعض مُخبر اتنے ذہین اور گھاگ ہوتے ہیں کہ زمین کے نیچے کی خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔

ایسے ہی ایک گاؤں میں رہنے والے ایک مخبر نے خان باز گل کو بتایا کہ ایک سکھ کی جوان بیوی کئی دنوں سے لاپتہ ہے اور سکھ اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اُس نے کسی کو بتایا نہیں کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ بیوی کے والدین کو بھی شک ہو گیا ہے کہ اُن کی بیٹی اپنے خاوند کے گھر میں نہیں ہے۔ مخبر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ بیوی بیمار نہیں اور وہ ضرور لاپتہ ہے۔

مخبر نے یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکی عام سکھ عورتوں سے بہت مختلف ہے۔ باتیں بھی صاف ستھری کرتی ہے اور رہتی بھی صاف ستھری ہے۔ دلیر اور نڈر ہے اور یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اُس کا خاوند اُسے مارتا پیٹتا تھا۔ وہ اپنے خاوند سے خوش نہیں تھی۔ اگر اس سکھ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے تو وہ اُسے قتل

کر دے گا اور اُس کے دوست کو بھی قتل کر دے گا۔

سکھوں کو میں جانتا تھا۔ وہ اپنی بہو بیٹی اور بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو نہیں دیا کرتے بلکہ خود سراغرسانی کر کے مجرموں کو سزا سُنا دیا کرتے تھے جو سزائے موت یعنی قتل سے کم نہیں ہُوا کرتی تھی۔ مخبر نے اس سکھ کے متعلق بھی خان باز گُل کو قبل از وقت خبردار کر دیا کہ قتل کی واردات ہونے والی ہے۔

خان باز گُل نے مجھے بتایا کہ اُس نے پروانہ کی بلکہ مخبر سے کہا کہ قتل ہونے دو تو کارروائی کریں گے۔ اُسے یہ بھی توقع تھی کہ یہ سکھ اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کو قتل کر کے خود ہی تھانے آجائے گا۔ یہ لوگ عموماً ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ ہمارے دیہات میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے کہ خاوند اپنی بے وفا بیوی کو یا اُس کے دوست کو یا دونوں کو قتل کر کے آلۂ قتل کے ساتھ تھانے چلا جاتا اور جُرم کا اقبال کر لیتا ہے۔

خان باز گُل اُن تھانیداروں میں سے تھا جو قتل کی واردات میں دونوں فریقوں سے مالی فائدہ حاصل کیا کرتے ہیں۔ مقتول کے لواحقین پولیس کو اس مقصد کے لیے کھلاتے پلاتے ہیں کہ قاتل کو پکڑا جائے اور ایسی شہادت پیش کی جائے کہ قاتل پھانسی سے نہ بچ سکے اور قاتل کے لواحقین مقدمہ کمزور رکھنے کے لیے پولیس کو منہ مانگی رشوت دیتے ہیں اور جب تھانیدار تفتیش کے لیے کسی گاؤں میں جا ڈیرا جماتا ہے تو اُس کی خاطر تواضع اتنی ہوتی ہے جتنی ملک کے صدر یا بادشاہ کی ہوتی ہوگی۔ خان

باز گُل اس پر بھی خوش ہُوا کہ یہ سکھ قتل کر کے خود تھانے نہ آیا تو اُسے پکڑنا مشکل نہیں ہوگا کیونکہ مخبر نے اُسے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی۔

"تم سکھ ہو، میں پٹھان ہوں"

دوسرے ہی دن تھانے میں اطلاع آئی کہ ایک عورت کی لاش ملی ہے جسے شناخت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ لاش کا سر نہیں ہے۔ خان باز گُل موقع پر گیا۔ لاش پر چادر پڑی تھی۔ چادر ہٹا کر لاش دیکھی۔ اس کا سر غائب تھا۔ گردن تیز دھار ہتھیار سے کاٹ کر سر الگ کیا گیا تھا۔ ایک بازو کُہنی کے اُوپر سے کاٹ کر جسم سے الگ کیا گیا تھا اور ایک ٹانگ گھٹنے سے کاٹ کر الگ کر دی گئی تھی۔ جسم کے کٹے ہُوئے یہ حصّے وہاں نہیں تھے۔ لاش پر کلہاڑی یا چھُری کے بے شمار زخم تھے۔

لاش سے چار پانچ قدم دُور ایک گڑھا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لاش اس گڑھے میں سے بھیڑیوں یا گیدڑوں نے نکالی ہے۔ کہیں کہیں سے لاش کھائی ہُوئی تھی۔ کپڑے خون میں رنگے گئے اور ان پر مٹی جم گئی تھی۔ کپڑے پھٹ بھی گئے تھے۔ جو بازو سلامت تھا اس کی کلائی میں سونے کی دو باریک چُوڑیاں اور تین چار چوڑیاں کانچ کی تھیں۔ لاش کے ساتھ سونے کی اشیاء کی موجودگی بتاتی تھی کہ یہ قتل دشمنی کی بنا پر کیا گیا ہے، رہزنی کے لیے نہیں۔ لاش سُوج گئی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مرے

چار پانچ دن گزر گئے ہیں۔

اردگرد کا علاقہ چھانا گیا۔ موقعۂ واردات قریب ہی تھا یعنی مقتولہ کو قریب ہی قتل کیا گیا تھا۔ زمین پر خُون جما ہُوا اور جُوتیوں کے نشان تھے۔ اِن میں گیدڑوں، کُتّوں اور بھیڑیوں کے پنجوں کے بھی نشان تھے۔

ایک کھڈ میں ایک جھاڑی کے ساتھ ایک دوپٹہ پڑا تھا اور چند قدم ہٹ کر ایک پاؤں کی زنانہ چپل پڑی تھی۔ کھُرے کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ کئی دن گزر چکے تھے۔ کھُرے واضح نہیں رہے تھے۔ یہ دیہاتی علاقہ تھا۔ کہیں ویران اور بنجر زمین تھی، کہیں سرکنڈے اور کہیں کھیتیاں تھیں۔ گاؤں موقعۂ واردات سے کچھ دُور تھے۔ تھانے میں کسی عورت کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ خان باز گُل کو ایک مُخبر نے ایک ہی دن پہلے بتایا تھا کہ ایک سکھ کی بیوی لاپتہ ہے اور یہ بیوی اگر اُسے مل گئی تو قتل ہو جائے گی اور وہ آدمی بھی قتل ہو جائے گا جس کے ساتھ اُس کی بیوی گئی تھی۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے سے پہلے خان باز گُل نے اس سکھ کو، اُس کی ماں اور باپ اور اُس کی ساس اور سُسر کو وہیں بلا لیا جہاں لاش پڑی تھی۔ وہ آئے تو اس پٹھان تھانیدار نے باقی سب کو دُور کھڑا رہنے دیا اور اس سکھ یعنی خاوند کو لاش کے پاس لے جا کر کہا —— "یہ تمہاری بیوی کی لاش ہے۔ اگر اسے تم نے قتل نہیں کیا تو بتاؤ کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ تمہیں کس پر شک ہے؟"

سکھ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش نہیں ہے۔

دیہاتی سکھوں میں یہ بھی وصف تھا (جواب بھی ہو گا) کہ ضِد اور ہٹ کے پکّے تھے۔ بات صحیح ہو یا غلط سچ ہو یا جھوٹ، سِکھ اَڑ جائے تو اس سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا تھا۔ خان باز گُل سکھوں کے اس وصف سے واقف تھا۔

"تم سکھ ہو اور میں پٹھان ہوں" —— اُس نے اس سکھ سے کہا —— "اگر تم ضِد کے پکّے ہو تو میں تم سے زیادہ ڈھیٹ ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہاری بیوی کہاں ہے۔ اپنی بیوی کو میرے سامنے لے آؤ اور جاؤ چھُٹی کرو۔"

"میری بیوی نے کیا جُرم کیا ہے کہ تمہارے سامنے لے آؤں؟" —— سکھ نے بڑی دلیری سے کہا —— "تم بلا وجہ یہ قتل میرے سر تھوپ رہے ہو۔"

"میں تمہاری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہوں" —— خان باز گُل نے کہا۔

"تم اُس کی ہوا کو بھی نہیں دیکھ سکتے" —— سکھ نے جواب دیا —— "تم ٹھان خان ہو تو میں 'پانچ پیاروں' کا چیلا ہوں۔ اپنا سر کاٹ کر اپنی ہتھیلی ہ رکھ کر دکھا سکتا ہوں۔"

سکھ کے اس جواب کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سکھوں کی تاریخ دران کے عقیدوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ خان باز گُل پٹھان ہونے کے علاوہ تھانیدار بھی تھا۔ دیہاتی علاقے کا تھانیدار بادشاہ ہوتا ہے۔ ں نے سکھ پر غصّہ نہ جھاڑا کیونکہ وہ اپنی پاور اور اتھارٹی سے واقف تھا۔

اُس نے لاش کی پھٹی ہُوئی قمیض کا ایک ٹکڑا اور ایک ٹکڑا شلوار کا اپنے ایک آدمی کو دے کر کہا کہ جہاں کہیں پانی ملے وہاں یہ دونوں ٹکڑے اس طرح دھولاؤ کہ خون کا نشان نہ رہے۔ کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔

وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔ وہ آدمی دوڑ تا گیا۔ خان باز گُل نے سکھ کو اپنے دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ مجھے کسی کا بھی نام یاد نہیں رہا۔ اس سکھ کو آپ ہرنام سنگھ کہہ لیں تاکہ کہانی سُنانے اور سُننے میں آسانی رہے۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

خان باز گُل کو یہی شک تھا کہ یہ لاش ہرنام سنگھ کی بیوی کی ہے اور قاتل ہرنام سنگھ ہے۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی ساس اور سُسر کو بلایا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی لاش کے کپڑوں کے ٹکڑے دھولایا تھا۔ ساس اور سُسر نے لاش کی چُوڑیاں دیکھیں۔ کانچ کی چُوڑیاں بھی دیکھیں، قمیض اور شلوار کے دُھلے ہوئے ٹکڑے دیکھے تو دونوں نے کہا کہ یہ اُن کی بیٹی کی لاش ہے۔

اگر سَر مل جاتا تو شناخت صحیح ہو سکتی تھی۔ تلاش کے باوجود سر نہ ملا۔ شک تھا کہ کہیں دُور اور گہرا دبایا گیا ہو گا یا نہر میں پھینک دیا گیا ہو گا جو وہاں سے تھوڑی ہی دُور تھی۔ مقتولہ کی ساس یعنی ہرنام سنگھ کی ماں کو الگ بلا کر لاش، کپڑے اور چوڑیاں وغیرہ دکھائی گئیں۔ خان باز گُل نے اس عورت

کو آزادی سے کوئی رائے یا فیصلہ نہ دینے دیا۔ بڑی چالاکی سے اُسے اپنی بات پر لاتا رہا اور بُڑھیا سے کہلوایا کہ یہ اُس کی بہُو کی لاش ہے۔ مقتولہ کے سُسر سے بھی اُس نے یہی کہلوایا۔

دراصل خان باز گُل کے لیے سہولت اس میں تھی کہ ثابت ہو جائے کہ مقتولہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔ عام قسم کے تھانیداروں کی طرح وہ سراغرسانی کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اُسے وہ طریقے معلوم تھے جن سے وہ ہرنام سنگھ کو قاتل ثابت کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ قاتل واقعی ہرنام سنگھ تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ کے ماں باپ اور اُس کی بیوی کے ماں باپ سے کہلوا کر کہ یہ ہرنام سنگھ کی بیوی ہے، اُسی کے مطابق کاغذات تیار کیے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور سب کو تھانے لے گیا۔ ہرنام سنگھ کو اُس نے باقاعدہ حراست میں نہ لیا، تھانے میں بٹھائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ ہرنام خود ہی بیان دے دو اور سزا میں فائدہ اُٹھاؤ، مگر ہرنام سنگھ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ سیدھی اور شریفانہ بات سُنتا ہی نہیں تھا اور وہ جو بات کرتا وہ غصّے اور طعنے کے لہجے میں کرتا تھا۔

"پھر یہ بتا دو کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟" — خان باز گُل نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بیوی لاپتہ ہے۔ اگر تم نے اُسے قتل نہیں کیا تو رپورٹ درج کراؤ۔ میں اُسے تلاش کروں گا۔"

"تم میری بیوی کے باپ لگتے ہو؟" — ہرنام سنگھ نے کہا — "میں مرد

کا بچہ ہوں۔ واہگورو کا خالصہ ہوں۔ اپنی بیوی کو خود تلاش کروں گا۔ اگر مل گئی تو اُس کی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھا کر تمہارے تھانے میں تمہارے سامنے رکھ دُوں گا اور کہوں گا، یہ لو خان بابا اب مجھے باندھ لو۔"

"تو یہ صحیح ہے کہ تمہاری بیوی لاپتہ ہے"؟

"معلوم نہیں"۔۔۔ ہرنام سنگھ یہ تسلیم کر کے کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے بگڑ گیا اور بولا۔۔۔ "گم ہے یا گھر میں ہے، وہ میری بیوی ہے۔ میں جانوں وہ جانے۔ تم اُس وقت اس معاملے میں ٹانگ اڑانا جب میں تمہارے دفتر میں عرضی ڈالوں گا کہ میری بیوی ڈھونڈ دو۔"

"تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ اُس کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں"۔ خان بازگُل نے کہا۔

ہرنام سنگھ کی غیرت کو اتنی سخت چوٹ لگی کہ وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس نے خان بازگُل کو یہاں تک کہہ دیا۔۔۔ "تمہاری بیوی کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں؟ تمہاری بہن کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں؟ میرے ساتھ ہوش سے بات کرو۔ میں خالصہ ہوں مُسلا (مسلمان) نہیں ہوں۔"

خان بازگُل اُس وقت تک دوستانہ لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ہرنام سنگھ پھنس جائے اور اقبالِ جرم کر لے۔ اب اس سکھ نے اتنی سخت باتیں کہہ دیں تو خان بازگُل کا پٹھانی اور مسلمانی خون اُبل پڑا۔ اُس نے دو مسلمان کانسٹیبلوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ اسے (ہرنام سنگھ کو) لے جاؤ۔ اس کی پگڑی اتار دو اور اس کے بال رسّی سے باندھ کر

اسے لٹکا دو۔۔۔ سکھوں کے سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے ہوتے ہیں۔ سکھوں کے علاقوں کے اکثر تھانیدار سکھ ملزموں کو پہلی اوّیت یہ دیتے تھے کہ انہیں بالوں سے باندھ کر چھت کے ساتھ لٹکا دیتے تھے۔

خان بازگُل نے مجھے بتایا کہ وہ غصّے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اسے اب یہ خیال نہیں تھا کہ ہرنام سنگھ قاتل ہے یا نہیں۔ اب وہ اسے انتقاماً قاتل ثابت کرنے پر تُل گیا تھا۔

ہرنام سنگھ کو کانسٹیبل لے گئے تو خان بازگُل نے مقتولہ کی ماں اور اُس کے باپ کو بلایا۔ اُن سے پوچھا کہ اُن کی بیٹی کب سے لاپتہ تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے۔ ماں باپ سخت بھڑکے ہوئے تھے۔ اُن کی بیٹی قتل ہو گئی تھی۔ خان بازگُل نے انہیں اور زیادہ بھڑکایا۔ انہوں نے بتایا کہ ہرنام سنگھ ان کی بیٹی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ اُسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ اُن کی بیٹی تیسرے چوتھے دن ماں باپ کے گھر جاتی تھی اور خاوند اُس کے ساتھ جو سلوک کرتا وہ انہیں بتاتی تھی۔ اُسے (مقتولہ کو) شک تھا کہ ہرنام سنگھ نے کسی عورت کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ہرنام سنگھ اسی بات پر اُسے مارتا پیٹتا تھا کہ وہ اُسے باہر جانے سے روکتی تھی اور آئے دن لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔

مقتولہ کے ماں باپ نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ ان کی بیٹی کو ہرنام سنگھ نے قتل کیا ہے۔ دراصل یہی کوشش خان بازگُل

کی تھی۔ وہ اُن کے جذبات کو چھیڑ چھیڑ کر اُن کے منہ سے اپنے مطلب کی باتیں نکلوا رہا تھا۔ مقتولہ کے ایک بھائی کو اُس نے اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ بھائی ہرنام سنگھ کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ خان بازگل نے اُسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا اور اُسے یقین دلایا کہ وہ خود اسے پھانسی کی سزا دلائے گا۔

ہرنام سنگھ کی ماں کو الگ اور باپ کو الگ بلا کر خان بازگل نے پوچھ گچھ کی۔ قدرتی طور پر انہوں نے اپنے بیٹے کے حق میں باتیں کیں اور اُسے بچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مقتولہ کے خلاف باتیں کیں اور اُس پر یہ وہ الزام عائد کیا جو کسی عورت کو بدنام کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ خان بازگل نے اپنی استادی سے اُن سے یہ کہلوا لیا کہ ہرنام سنگھ اُسے اکثر مارتا پیٹتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہرنام سنگھ کو اُس کے چال چلن پر شبہ تھا۔ وہ یہ نہ بتا سکے کہ اُس کے مراسم کس کے ساتھ تھے۔ مقتولہ کے متعلق انہوں نے یہ خاص بات بتائی کہ وہ مسلمان گھرانوں میں زیادہ جاتی تھی اور گھر میں مسلمانوں کی طرح رہنے سہنے کے طریقے رائج کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس کی دو سہیلیاں تھیں۔ دونوں مسلمان تھیں۔

مقتولہ کی گمشدگی کے متعلق انہوں نے بتایا کہ پانچ روز گزرے، وہ رات کو خاوند کے ساتھ کوٹھے پر سوئی تھی۔ صبح معلوم ہوا کہ غائب ہے۔ ٹرنک دیکھے تو پتہ چلا کہ تمام زیورات اور جو رقم اُس کے ہاتھ لگی لے گئی ہے۔ اُس کے خاوند (ہرنام سنگھ) نے اپنے والدین اور دونوں بھائیوں کو

دھمکی دے کر کہا کہ باہر کسی سے ذکر نہ کریں کہ لڑکی غائب ہے۔ وہ ابھی لڑکی ہی تھی۔ شادی کو ڈیڑھ برس ہوا تھا اور اُس کی عمر بائیس تیئیس سال تھی۔ ہرنام سنگھ کے دو بھائی تھے۔ دونوں اس سے چھوٹے تھے لیکن جوان تھے۔

ہرنام سنگھ نے بیوی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کلہاڑی اُٹھائے سارا دن غائب رہتا تھا۔ اُس نے اُن مسلمان گھرانوں کے دو جوان آدمیوں کو بھی دھمکیاں دی تھیں جہاں اس کی بیوی جاتی رہتی تھی۔ ہرنام سنگھ کو شک تھا کہ ان دونوں میں سے کسی نے اس کی بیوی اُڑا لی ہے۔

لاش کے ٹکڑے کیوں کیے؟

خان بازگل نے ہرنام سنگھ کے بھائیوں کو بلایا۔ ان میں سے ایک کی عمر بیس اکیس سال اور دوسرا اس سے دو اڑھائی سال چھوٹا تھا۔ دونوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان سے سوال جواب ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ مقتولہ سے بہت ہی نالاں تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دیہاتی سکھوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ ایک بھائی کی بیوی پر دوسرے بھائیوں کا بھی خاوندوں جیسا حق ہوتا تھا۔ خان بازگل نے ہرنام سنگھ کے بھائیوں سے اس رواج کے متعلق سوال کیا۔

"وہ تو نام کی سکھ تھی" — دونوں بھائیوں نے مقتولہ کو گالیاں دے کر کہا — "اسے طور طریقے مسلمانوں والے اچھے لگتے تھے۔ کہتی تھی کہ

جس کے ساتھ میری شادی ہُوئی ہے وہی میرا خاوند ہے۔ اس بات پر ہرنام سنگھ نے اُسے مارا پیٹا بھی تھا۔ اُس نے (مقتولہ نے) کہا تھا کہ میرے ساتھ جانوروں والا سلوک کرو گے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی یا گھر سے بھاگ جاؤں گی۔"

ان بھائیوں نے یہ بھی بتایا کہ ہرنام سنگھ اپنی بیوی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ اُن سے یہ بھی کہلوالیا گیا کہ ہرنام سنگھ کی توجہ باہر کسی عورت کی طرف تھی لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ہرنام سنگھ کی بیوی اس کے ساتھ کئی بار لڑی تھی۔ چونکہ وہ دلیر اور نڈر لڑکی تھی اس لیے وہ تین بار کلہاڑی اُٹھا کر ہرنام سنگھ پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اگر گھر میں ہرنام سنگھ اکیلا ہوتا تو بیوی اُسے قتل کر دیتی۔

خان باز گُل نے سوچا کہ مقتولہ کو گھر سے غائب ہوئے پانچ دن گزر گئے ہیں۔ بعد میں پوسٹمارٹم رپورٹ سے پتہ چلا کہ اُسے قتل ہوئے چار روز گزر گئے ہیں۔ اگر اُس کے غائب ہونے والے دن ہی ہرنام سنگھ نے اُسے قتل کر دیا تھا تو پھر (اُس کے والدین اور بھائیوں کے بیانات کے مطابق) وہ اس کی تلاش میں کیوں مارا مارا پھرتا رہا؟ شاید اُس نے اُسی روز اُسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا ہوگا اور اب اُس آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوگا جس کے ساتھ مقتولہ گئی تھی۔ وہ آدمی ہرنام سنگھ کے ہاتھ سے بچ کے نکل گیا ہوگا۔

ہرنام سنگھ نے خان باز گُل کو یہ بھی کہا تھا کہ اُسے اُس کی بیوی مل گئی تو وہ اُسے قتل کر کے اُس کی لاش تھانے میں خود ہی لے آئے گا۔

ان بیانات کی روشنی میں تو یہ نظر آتا تھا کہ قاتل ہرنام سنگھ نہیں۔ خان باز گُل کے دماغ میں ایک اور بات آئی۔ ہرنام سنگھ کے ماں باپ کے بیان سے پتہ چلا تھا کہ مقتولہ زیورات اور رقم لے گئی تھی۔ یہ اشیاء بھی اس کے قتل کا باعث ہو سکتی تھیں۔ راستے میں کوئی رہزن مل گیا ہوگا۔ مقتولہ ابھی اپنے آشنا تک نہیں پہنچی ہوگی اور رہزنوں کے ہاتھوں لُٹ گئی اور شاید مزاحمت کے باعث قتل ہو گئی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جس کے ساتھ بھاگی تھی اُسی نے اُسے دھوکہ دیا اور اُسے زیورات اور رقم کے لالچ میں قتل کر کے اس کی لاش دبا گیا۔ مگر اُس نے ایک ٹانگ، ایک بازو اور سر کاٹ کر کہاں غائب کیا اور کیوں کیا؟ لاش کی یہ حالت انتقام کے شدید جذبے کے تحت کی جاتی ہے۔ قاتل اس قدر مشتعل ہوتا ہے اور اُس کے دل میں مقتول کی اتنی زیادہ نفرت ہوتی ہے کہ وہ لاش کا قیمہ بنا دیتا ہے۔ اگر مقتولہ کو اس کے دوست نے قتل کیا ہوتا تو لاش کی یہ حالت نہ کرتا۔ اس کا گلا گھونٹ دیتا یا سر پر کلہاڑی کا ایک ہی وار کافی تھا۔ لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے اشتعال، انتقام اور حقارت کی انتہائی شدت کی کیفیت میں قتل کیا گیا ہے۔ لہٰذا قاتل خاوند ہو سکتا تھا۔

خان باز گُل اُس جہنمی کمرے میں گیا جہاں ہرنام سنگھ بالوں سے بندھا ہُوا تھا۔ اُسے لٹکایا نہیں گیا تھا۔ اُسے پیٹھ کے بَل لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے بال دو حصوں میں دو رسّیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کانسٹیبل ذرا دُور بیٹھا دونوں رسّیوں کے سرے پکڑے ہُوئے زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

ہرنام سنگھ درد سے تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کرتا تھا مگر ایک کانسٹیبل اس کے دونوں ہاتھوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر کھڑا تھا اور بار بار کہتا تھا — "ہرنامے ایک دے۔ ہرنامے ایک دے" — اور ہرناما انہیں ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔

خان باز گل نے جب اُسے دیکھا، کم و بیش چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ ہرنام سنگھ کا اتنا پسینہ بہ چکا تھا کہ فرش پر پانی کی طرح اِدھر اُدھر جا رہا تھا، مگر وہ سخت جان اتنا تھا کہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ خان باز گل نے اسے اس سے بھی زیادہ ظالم اذیت میں ڈال دیا۔

مجھے اس پٹھان تھانیدار کی یہ بات ساری عمر نہیں بھولے گی۔ اس نے مجھے یہ واردات سناتے ہوئے کہا تھا — "میں پٹھان ہوں۔ اپنی تاریخ کو میں نہیں بھول سکتا۔ مجھے سکھوں اور پٹھانوں کی لڑائیاں بچپن میں سنائی گئی تھیں۔ ہندوستان کے مجاہدین سرحد میں آ کر سکھوں کے خلاف لڑے تھے۔ میں یہ نہیں بھول سکتا کہ سکھ اور انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ میں اپنے بچوں کو وہی تاریخ سنایا کرتا ہوں جو مجھے باپ نے سنائی تھی۔ باپ کو یہ تاریخ میرے دادا نے سنائی تھی۔ میرا دادا سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ آج میرا یہ حال ہے کہ سکھوں کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ اس سکھ کو اپنے شکنجے میں لے کر میں جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ میرے دل میں ذرا سا بھی رحم نہیں تھا۔ مسلمانوں میں یہی خرابی ہے کہ وہ اپنے دشمن کو بھول کر اُسے اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں۔"

یہ تو خان باز گل کا قومی جذبہ تھا جس کی میں نے اُس کے منہ پر بھی تعریف کی لیکن جہاں تک تھانیداری کا اور تفتیش کا تعلق تھا وہ بڑی ہی غلط اور کمزور بنیاد پر کام کر رہا تھا۔ وہ مجھے واردات اور تفتیش کی روئیداد سنا رہا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اس نے ایسی لاش کی شناخت کتنی غلط کرائی تھی جس کا چہرہ اور سر تھا ہی نہیں۔ مشتبہ (ہرنام سنگھ) کی ساس اور سسر نے صرف عداوت کی بنا پر کہہ دیا تھا کہ یہ اُن کی بیٹی کی لاش ہے اور اسے ہرنام سنگھ نے قتل کیا ہے۔ خان باز گل کیس ہرنام سنگھ پر ہی مکمل کرنے اور اُسے سزا دلانے کے لیے اُس کے ماں باپ سے استادی سے اپنے مطلب کی باتیں نکلواتا رہا۔ اُس نے تھانیداری کا یہ مظاہرہ کیا کہ ہرنام سنگھ کو تھرڈ ڈگری (تشدد) میں ڈال دیا۔ اس نے سارا دن اُس پر تشدد کیا۔ رات کو بھی اسے تشدد اور طرح طرح کی اذیتوں کا تختۂ مشق بنائے رکھا اور اُسے کہتا رہا کہ وہ اقبالِ جُرم کر لے۔

ہرنام سنگھ نے اس کی بات نہ مانی۔ اُس کی حالت یہ ہو گئی کہ اُس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے دن کے پچھلے پہر ہرنام سنگھ ایسا بے ہوش ہُوا کہ منہ پر پانی پھینکنے اور منہ میں پانی ڈالنے کے باوجود ہوش میں نہ آیا۔ موسم سخت گرم تھا۔ اُسے ہوش میں لانے کی کوششیں ہو رہی تھیں کہ امرتسر سے اطلاع آ گئی کہ کل پولیس کپتان جو انگریز تھا دَورے پر آ رہا ہے۔ یہ انگریز دراصل شکار کھیلنے کہیں جا رہا تھا۔ اُس نے راستے میں پڑنے والے تھانوں کو اطلاع دے دی کہ وہ مختصر سے

دورے پر آرہا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی خان بازگل پریشان ہوگیا۔ اُس کے پاس اسسٹنٹ سب انسپکٹر نہیں تھا۔ کوئی ہوتا تو اسے مشورہ دیتا کہ غصّے اور انتقام کے تحت تفتیش نہیں کی جاتی اور ابتدائی کارروائی گہری سوچ کے بعد کی جاتی ہے۔ اس کا ہیڈ کانسٹیبل عقل والا آدمی تھا۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا۔ اس نے اُسے بتایا کہ ملزم کل تک ہوش میں نہ آیا تو پولیس کپتان ہم سب کو معطل کر دے گا لاش کی شناخت بالکل غلط ہوئی ہے اور تفتیش کی بنیاد نہ صرف کمزور ہے بلکہ طریقۂ کار کے منافی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اسے کہا کہ یہ واردات چھپائی بھی نہیں جا سکتی۔ انگریز افسر تفتیش میں تشدد اور اذیت رسانی کے خلاف تو نہیں تھے بعض کیسوں میں اسے ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے لیے ٹھوس وجہ ہونی چاہیئے جو خان بازگل کے پاس نہیں تھی۔

ایک ڈرامہ، ایک معجزہ

اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس نے ہرنام سنگھ کے منہ میں دودھ ڈالا اور کئی جتن کر کے اُسے ہوش میں لائے۔ خان بازگل نے اسے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور قاتل کو تلاش کرنے میں پولیس کی مدد کرے۔ اُسے تسلی دی گئی کہ اس کے خلاف جو شک تھا وہ رفع ہوگیا ہے۔ ہرنام سنگھ نے بڑی

ہی نحیف آواز میں کہا کہ اُسے سو فیصد یقین ہے کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش نہیں ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ قاتل کو زندہ نہیں لائے گا، بلکہ اُس کی لاش لائے گا اور اس کے ساتھ اُس کی بیوی کی بھی لاش ہوگی۔

اُس نے یہ باتیں گو تو دیں لیکن اس کی آواز میں جان نہیں تھی اور وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ خان بازگل نے اُسے خوب کھلایا پلایا۔ اسے شراب منگوا کر پلائی اور اسے گھر بھیج دیا۔

دوسرے دن پولیس کپتان آگیا۔ اُس نے تھانے کا معائنہ کیا۔ ریکارڈ دیکھا اور اُس کے سامنے یہ واردات آگئی۔ خان بازگل نے پولیس کپتان کو بتایا کہ ابھی تک کسی پر شک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ لاش بغیر سر کے تھی اس لیے شناخت ممکن نہیں۔ اس نے وہ کاغذات چھپا لیے تھے جن میں ہرنام سنگھ کے سسرال اور والدین کے بیانات قلمبند کیے گئے تھے۔ اُس نے پولیس کپتان کو بتایا کہ سر اور جسم کے دیگر حصوں کی تلاش جاری ہے۔

پولیس کپتان نے اسے کچھ ہدایات دیں اور مشورے بھی دیئے۔

اب جبکہ یہ واردات پولیس کپتان کی نظر میں آگئی تھی اسے وہ گول نہیں کر سکتا تھا۔ عموماً ایسے کیس میں جن میں مقتول کے وارثوں کا ہی سراغ نہ ملے اور کہیں سے کسی کی گمشدگی کی بھی رپورٹ نہ آئے تھانیدار کوئی سراغرسانی نہیں کرتے۔ کیس فائلوں میں دفن ہو جاتا ہے، اور اگر تھانیدار دلیر ہو تو فائلوں میں بھی اس کا نام و نشان نہیں رہنے دیتا۔ خان بازگل کے لیے یہ راستہ بند ہوگیا تھا۔

اُس نے ہرنام سنگھ کو گھر بھیج دیا اور دو مخبر اُس کے پیچھے لگا دیئے۔ یہ دونوں اس کے گاؤں کے ہی آدمی تھے۔ اُن کے لیے ہدایت یہ تھی کہ ہرنام سنگھ کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہیں اور رپورٹ دیتے رہیں، لیکن ہرنام سنگھ کی جسمانی حالت اتنی بُری ہو چکی تھی کہ وہ تین چار دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ اُسے بڑی ہی ظالمانہ اذیتیں دی گئی تھیں جو مہلک بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ تو گھر میں پڑا اتھا اور اُس کی بیوی کا باپ اور بھائی صبح شام تھانے میں آتے اور خان باز گل سے پوچھتے کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے اور ہرنام سنگھ کو کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ لوگ دیہاتی اور اَن پڑھ تھے۔ وہ مطالبہ یا احتجاج نہیں کرتے تھے۔ ان کا انداز درخواست اور التجا کا ہوتا تھا۔ خان باز گل کے پاس ٹال مٹول کے کئی ذریعے تھے جو اس نے استعمال کیے۔ ابھی وہ انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ مقتولہ اُن کی بیٹی نہیں تھی۔ دراصل اس کا اپنا یقین قائم نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں (ہرنام سنگھ کے سُسرال) نے مقتولہ کی لاش اپنے دستور کے مطابق جلا دی تھی۔ اسے وہ اپنی ہی بیٹی سمجھ رہے تھے۔

کیس میں ایک ڈرامائی واقعہ ہو گیا۔ خان باز گل کسی کیس کی گواہی کے لیے امرتسر گیا۔ اس کے ساتھ اپنا ایک مُخبر تھا جو اس کیس میں جھوٹا گواہ تھا۔ پولیس کو یہ ڈھنگ بھی کھیلنے پڑتے ہیں کہ شہادت میں خلارہ جائے یا کوئی کڑی کمزور ہو تو جھوٹے گواہوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وہ متعلقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا تو وہاں ایک جوان لڑکی مجسٹریٹ کے پاس اپنا یہ بیان قلمبند کرا رہی تھی کہ وہ بالغ اور غیر شادی شدہ ہے اور وہ اپنی مرضی

سے اس آدمی کے ساتھ گھر سے نکلی ہے۔ اُس نے سفید بُرقعہ لے رکھا تھا اور اُس کا منہ ننگا تھا۔

خان باز گل کے لیے یہ کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی تھیں، اپنی مرضی سے گھروں سے بھاگ بھی جاتی تھیں۔ مجسٹریٹوں کے پاس بیان قلمبند ہوتے رہتے تھے۔ پھر یہ واقعات قتل اور خودکشی کا باعث بھی بنتے تھے۔ پولیس کے لیے یہ کوئی نرالی بات نہیں تھی مگر خان باز گل کے ساتھ جو مخبر تھا اُس نے اُسے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔

"خان صاحب"۔۔۔ اُس نے سخت حیرت کے لہجے میں کہا۔۔۔ "اللہ جھوٹ نہ بلوائے، یہ تو ہرنام سنگھ کی بیوی ہے۔"

"تمہارے دماغ کو گرمی لگ گئی ہے"۔۔۔ خان باز گل نے مخبر سے کہا۔۔۔ "یہ کوئی مسلمان لڑکی ہے۔ ہرنام سنگھ کی بیوی قتل ہو کر چتا میں جل بھی چکی ہے۔"

مخبر ہرنام سنگھ کے گاؤں کا تھا۔ ہر گھر کے بچے بچے کو پہچانتا تھا۔ خان باز گل کے لیے تمام چہرے اجنبی تھے۔ مُخبر نے ذرا آگے ہو کر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ لڑکی نے اسے دیکھا تو بُرقعے کو ذرا سا سر کا کر آدھا چہرہ چھپا لیا۔ مخبر نے خان باز گل سے کہا کہ دو انسانوں کی شکلیں ایک جیسی بھی ہو سکتی ہیں مگر ایسی نہیں کہ ناک نقشے میں بال برابر بھی فرق نہ ہو۔

لڑکی کا بیان قلمبند ہو گیا۔ عدالتی کارروائی مکمل ہو گئی تو لڑکی نے چہرہ بُرقعے میں چھپا لیا اور ایک آدمی کے ساتھ عدالت سے نکل گئی۔ یہ آدمی

وجیہہ جوان تھا۔ قدبُت بھی اچھا، شکل وصورت بھی اچھی۔

خان بازگُل نے باہر جاکر اس آدمی کو بازو سے پکڑا اور الگ لے جاکر پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں سے اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا — "یہ لڑکی شادی شدہ ہے اور سکھ ہے"۔

اس آدمی نے صاف الفاظ میں جواب دیا "میں مسلمان ہوں اور امرتسر پولیس میں کانسٹیبل ہوں۔ آپ بھی مسلمان ہیں۔ آپ نے لڑکی کو پہچان لیا ہے اس لیے میں آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ یہ لڑکی واقعی سکھ ہے، اور شادی شدہ بھی ہے"۔

کانسٹیبل وردی میں نہیں تھا۔ اُس نے لڑکی کے خاوند کا نام بتایا اور اس کے گاؤں کا نام بھی بتایا۔ مخبر کی شناخت صحیح نکلی۔ وہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔

"اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو میری مدد کریں" — کانسٹیبل نے کہا — "یہ لڑکی مسلمان ہوگئی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نکاح پڑھا لیا ہے۔ دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس نے عدالت میں بیان دلوادو کہ یہ مسلمان ہے، غیر شادی شدہ اور بالغ ہے اور اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔ بیان ہوچکا ہے۔ عدالت ہمارے حق میں فیصلہ دے چکی ہے۔ اب اگر آپ گڑبڑ کریں گے تو میں بھی اور لڑکی بھی جھوٹا بیان دینے کے جرم میں سزا پائیں گے اور کسی کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کا جرم الگ ہے"۔

خان بازگُل چکرا گیا۔ پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ مقتولہ اگر ہرنام سنگھ کی

بیوی نہیں تھی تو اور کون تھی؟ ہرنام سنگھ کو تو خان بازگُل نے اس بنا پر شکنجے میں لے لیا تھا کہ مخبر نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ اس کی بیوی لاپتہ ہے اور ہرنام سنگھ کو وہ جہاں بھی نظر آئی اس کے ہاتھوں قتل ہوجائے گی لہٰذا یہ فرض کرلیا گیا کہ اسے بیوی مل گئی تھی جسے اس نے قتل کردیا۔ اب پتہ چلا کہ وہ قتل نہیں ہوئی۔ پھر قتل ہونے والی کون تھی؟ اور اُس کے وارثوں نے ابھی تک اُس کی گمشدگی یا قتل کی رپورٹ کیوں نہیں دی تھی؟ یہی ہوسکتا تھا کہ مقتولہ کو کہیں دور سے لاکر یہاں قتل کیا گیا ہے۔

یہ تو بعد کا مسئلہ تھا۔ فوری مسئلہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ خان بازگُل ہرنام سنگھ کی بیوی اور کانسٹیبل کو گرفتار کرے یا اپنے مذہب کا احترام کرتے ہوئے انہیں جانے دے۔ کانسٹیبل نے جس صاف گوئی اور دلیری سے اور جذباتی انداز سے حقیقت بتادی تھی، اس سے خان بازگل بہت متاثر ہُوا۔ کانسٹیبل گجرات کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ خان بازگل نے اُسے کہا کہ اُسے اس لڑکی پر بھروسہ ہے تو اسے فوراً گجرات اپنے گھر چھوڑ آئے، اور اگر اسے امرتسر میں رکھنا ہے تو اسے پوری طرح چھپائے رکھے لیکن بہترین اور محفوظ صورت یہ ہے کہ امرتسر سے تبدیلی کرا کے یہاں سے دُور چلا جائے۔

خان بازگُل نے اپنے مخبر کو جو عورش قسمتی سے مسلمان تھا سختی سے کہا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے۔ اگر اُس نے کسی کو بتادیا تو اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ غریب سے مخبر میں اتنی جرأت کہاں کہ اپنے علاقے کے

تھانیدار کے حکم کی خلاف ورزی کرتا۔

یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ یہ لڑکی اس کانسٹیبل کے پاس کس طرح پہنچی۔ یہ ڈرامہ سنانے سے پہلے میں اپنی طرف سے ایک دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اُس زمانے میں مردوں کے قدبُت دیکھنے کے قابل ہوتے تھے اور صحت ایسی کہ چہروں پر جلالی سی رونق ہوتی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں کی تو شان ہی کچھ اور تھی۔ چھ چھ فٹ تو قد ہوتے تھے۔ جسم گٹھے ہوئے اور چہرے بھرے ہُوئے۔ طبیعت، مزاج اور کردار بھی مردوں جیسا ہوتا تھا۔ اب ایسے جوان کہاں نظر آتے ہیں۔ شہر کے نوجوانوں کو تو جیسے دیمک اور چیونٹیاں کھا گئی ہیں۔ فوج میں بھی ہمارے زمانے والے جوان نہیں ملتے۔ سڑکوں پر گشت کرنے والے پولیس کے کانسٹیبلوں کی وردی اور اُن کی جسمانی حالت دیکھ کر پولیس کے محکمے پر ترس آتا ہے۔

لڑکی اور کانسٹیبل کی کہانی

خان باز گُل نے مجھے بتایا کہ یہ کانسٹیبل بڑا خوبصورت جوان تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ امرتسر میں سکھوں کا دربار ہے جو سکھوں کی سب سے زیادہ مقدس عبادت گاہ ہے۔ بہت خوبصورت عمارت ہے۔ وہاں زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ وہاں شروع سے ہی پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ کانسٹیبل گشت بھی کرتے ہیں۔ اس مسلمان کانسٹیبل کی بھی وہاں ڈیوٹی

لگا کرتی تھی۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں اس لیے میں اسے کانسٹیبل ہی کہوں گا۔ قتل کی واردات سے چار پانچ مہینے پہلے یہ کانسٹیبل دربار صاحب کے باہر ڈیوٹی پر تھا۔ دو تین سکھ عورتیں اس کے پاس آئیں اور اسے بتایا کہ ان میں سے ایک کا بھتیجا جس کی عمر سات آٹھ سال تھی کہیں کھو گیا ہے۔ یہ ہرنام سنگھ کی بیوی کا بھتیجا تھا۔ وہ بہت گھبرائی ہُوئی تھی۔ اُس کے ساتھ گاؤں کی عورتیں تھیں۔ یہ لڑکی اچھی شکل وصورت کی تھی اور یہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔ کانسٹیبل نے اس کے بھتیجے کی تلاش شروع کر دی۔ لڑکی اس کے ساتھ رہی۔ دوسری عورتیں دربار صاحب کے اندر چلی گئیں۔ لڑکی نے کانسٹیبل کو بتایا کہ اُس نے دو کانسٹیبلوں سے کہا تھا کہ اس کے بھتیجے کو ڈھونڈ دیں لیکن انہوں نے توجہ نہیں دی۔

بچہ مل گیا۔ وہ بھیڑ میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ایک دکاندار نے اُسے روتا دیکھ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ ہرنام سنگھ کی یہ نوجوان بیوی کانسٹیبل کی مشکور تھی اور اس کی ذات اور کردار سے متاثر بھی ہُوئی۔ دِلی لگاؤ وہیں پیدا ہو گیا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ اسے مسلمان اچھے لگتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی پندرہ بیس روز بعد امرتسر جانے لگی اور کانسٹیبل کے ساتھ اس کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

خان باز گُل نے کانسٹیبل کی سُنائی ہوئی باتیں مجھے سنائیں تو میں نے یہ رائے قائم کی کہ ہرنام سنگھ کی بیوی اس کانسٹیبل کی ظاہری شکل وصورت سے اور قدبُت سے بھی ضرور متاثر ہوئی ہو گی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اُسے

سکھوں سے نفرت تھی۔ اس کی ساس، سُسر اور ہرنام سنگھ کے بھائی بنا چکے تھے کہ اس کی سہیلیاں مسلمان تھیں، اور وہ مسلمان گھرانوں میں آتی جاتی تھی۔ کانسٹیبل کو اس لڑکی نے بتایا کہ اس کے خاوند کے بھائی بھی اسے اپنی بیوی سمجھتے ہیں۔ اُسے سکھوں کے اس رواج سے نفرت تھی۔ وہ صاف سُتھری رہنے والی لڑکی تھی۔ سکھوں کی جسمانی غلاظت اور سر سے پاؤں تک بالوں ہی بالوں کے علاوہ اُسے ان کی عادتوں کی گندگی اور زبان کی غلاظت یعنی گالی گلوچ سے کراہیت آتی تھی۔

لڑکی نے کانسٹیبل کو ایک وجہ یہ بھی بتائی کہ اُس کے خاوند نے کسی دوسرے گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ مراسم قائم کر رکھے تھے۔ اس لڑکی کے رشتہ دار اس کے گاؤں میں بھی تھے۔ وہ کبھی کبھی اُن کے گاؤں آیا کرتی تھی۔ ہرنام سنگھ اُسے اپنے گاؤں میں ملنے کے علاوہ کبھی کبھی اُس کے گاؤں چلا جاتا یا اُسے باہر کہیں بلا لیتا تھا۔ ہرنام سنگھ کی بیوی نے کسی عورت کی مدد سے ان دونوں کے تعلقات اور ملاقاتوں کی سراغرسانی کر لی تھی۔ اس نے جب ہرنام سنگھ کو اس لڑکی سے ملنے سے منع کیا تو ہرنام سنگھ نے اس کی پٹائی کر دی۔ پھر آئے دن ان کا لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔

لڑکی کو امرتسر میں یہ کانسٹیبل مل گیا۔ یہ اتفاقیہ ملاقات تھی۔ کانسٹیبل ویسا ہی صاف ستھرا مسلمان تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ کچھ تو وہ پہلے ہی دلیر اور نڈر تھی، گھریلو حالات نے اسے اور زیادہ دلیر بنا دیا۔ کانسٹیبل سے ملاقات ہوئی تو اتنی زیادہ نڈر ہو گئی کہ اتنی دُور گاؤں سے دربار صاحب کی زیارت

کے بہانے امرتسر جانے لگی۔

کانسٹیبل اس کی اُمیدوں کے مطابق نکلا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ گھر سے بھاگ کر اُس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کرے تو وہ مسلمان ہو جائے گی۔ ان کی محبت پاک صاف تھی۔ اس سے بھی وہ بہت متاثر تھی۔ کانسٹیبل نے اسے کہا کہ وہ آ جائے۔ ایک روز لڑکی زیورات اور کچھ رقم لے کر آ گئی۔ کانسٹیبل نے اپنے ایک دوست کی مدد سے رہائش کا انتظام کر لیا۔ لڑکی کو ایک مولوی کے ہاتھ پر مسلمان کر لیا گیا اور اسی مولوی نے نکاح پڑھا دیا۔ اس سلسلے میں جھوٹ یہ بولا گیا کہ لڑکی غیر شادی شدہ ہے۔ کانسٹیبل کو اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں لڑکی کو لے جا کر اس کا بیان قلمبند کرا لیا جائے۔ چنانچہ قانون کا یہ تحفظ حاصل کر لیا گیا اور وہاں ان کی ملاقات خان بازگل سے ہو گئی۔

جہاں تک خان بازگل کا تعلق تھا ہرنام سنگھ کی بیوی کی کہانی یہیں پر ختم ہو گئی تھی۔ اُس نے کانسٹیبل سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کی مدد کرے گا۔ اُس نے اسلام کے رشتے کا حق ادا کر دیا۔ اُسے اس پر بہت خوشی ہوئی کہ لڑکی نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ خان بازگل امرتسر میں اپنی گواہی سے فارغ ہو کر اپنے تھانے میں چلا گیا جو دیہات میں تھا۔ اسے اب دو مسئلے پریشان کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ لاش کس عورت کی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ ہرنام سنگھ اور اُس کے والدین اور اُس کے سسرال کو کس طرح بتائے کہ جو لاش برآمد ہوئی تھی وہ ہرنام سنگھ کی بیوی نہیں تھی۔ یہ تو بتایا ہی نہیں

جا سکتا تھا کہ اُس کی بیوی زندہ ہے اور امرتسر میں ہے۔

وہ آخر تھانیدار تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ کے ماں باپ اور اُس کی بیوی کے ماں باپ کو تھانے بلایا۔

وہ جونہی تھانے میں داخل ہوئے خان بازگل نے گرج کر کہا — "اُن سب کو حوالات میں بند کر دو۔ انہوں نے جھوٹ بول کر پولیس کو گمراہ کیا ہے"۔ حالانکہ اس نے خود ہی استادی سے ان سے کہلوایا تھا کہ یہ ہرنام سنگھ کی بیوی کی لاش ہے۔

وہ چاروں خوف سے کانپنے لگے۔ سب نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ خان بازگل ان پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اس نے ان کی حالت ایسی پتلی کی کہ سب نے بیان دیا کہ انہوں نے شک میں شناخت کی تھی۔ ہرنام سنگھ کے سُسر سے اس نے یہ بھی کہلوا لیا کہ اُس نے ہرنام سنگھ کو سزا دلانے کی خاطر کہا تھا کہ یہ اُس کی بیٹی کی لاش ہے اور اُسے ہرنام سنگھ نے قتل کیا ہوگا۔ خان بازگل نے نمبردار کو اور دو تین معزز افراد کو بلا کر ان کے سامنے سُسر وغیرہ کے بیان لیے۔

یہ سراسر دھاندلی اور سکھا شاہی تھی جو یہ پٹھان تھانیدار کر رہا تھا۔ وہ اپنی ابتدائی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک صورت یہ بھی آئی تھی کہ اس شناخت کو چلنے دے اور مقتولہ کو ہرنام سنگھ کی بیوی رہنے دے اور ہرنام سنگھ کو ہی گرفتار کر کے مقدمہ قائم کر دے، مگر اسے دو تین خطرے نظر آ رہے تھے۔ ایک یہ کہ امرتسر والا کانسٹیبل ہرنام سنگھ کی بیوی کو امرتسر سے خائف کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا تو یہ کیس خان بازگل پر ہی نہ آ پڑے اور وہ اعانتِ جرم کا مجرم بن جائے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کپتان سے وہ گھبراہٹ میں کہہ چکا تھا کہ لاوارث لاش ملی ہے جو قتل کی واردات ہے۔ تیسرا خطرہ یہ کہ کسی بھی وقت اس کے پاس لاش کا سر، بازو اور ٹانگ آ سکتی تھی جو معلوم نہیں کہاں دفن تھیں۔ مقتولہ کے وارث رپورٹ لے کر آ سکتے تھے۔

پٹھان اور سکھ کی ملاقات

خان بازگل نے اِدھر سے تو جان چھڑا لی مگر لاوارث مقتولہ اُس کے ذہن پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ ہرنام سنگھ بھی اس کے دماغ پر سوار ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ ہرنام سنگھ نے خان بازگل کو نمبردار کی زبانی پیغام بھیجا کہ تم نے میرے سُسرال کے کہنے پر مجھے تھانے میں بے بس کر کے میرا جسم توڑا ہے۔ اب تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ لاش میری بیوی کی نہیں تھی۔ اب میں تم سے بدلہ لوں گا۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔ میرے ہاتھ پر واہگورو نے دو کی جگہ تین قتل لکھ دیئے ہیں۔ ایک اپنی بیوی، دوسرا وہ آدمی جس کے ساتھ وہ گئی ہے اور تیسرے تم۔ اگر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرو گے تو سارا پنجاب سُنے گا کہ ایک اور ڈاکو میدان میں آ گیا ہے جس کا نام ہرنام ڈاکو ہے۔ لوگ بھگتے اور ماہن سنگھ کو بھول جائیں گے۔ (بھگتا اور ماہن سنگھ اس علاقے کے بہت بڑے ڈاکو اور رہزن تھے)۔

خان بازگل نے ہرنام سنگھ کو تھانے بلایا۔ ہرنام سنگھ نے پیغام کا جواب

دیا کہ نہ میں تمہارے تھانے میں آتا ہوں نہ تم میرے گاؤں میں آؤ۔ دونوں جگہوں کے درمیان ملاقات ہوگی۔ پٹھان کے حلالی بچے ہو تو اپنے ساتھ پولیس کی گارد نہ لانا۔ خان بازگل نے پٹھان کا حلالی بچہ بن کر دکھا دیا۔ وہ ہرنام سنگھ سے ملنے اکیلا گیا۔ ہرنام سنگھ کلہاڑی لے کر آیا تھا۔ خان بازگل بغیر ور دی گیا۔ اُس کے پاس ریوالور بھی نہیں تھا، کوئی اور ہتھیار بھی نہ تھا۔ اس نے ہرنام سنگھ کو دوستانہ طریقے سے سمجھایا کہ تھانیداری کے فرائض میں اُسے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خان بازگل نے اُسے بتایا کہ وہ قتل کی دھمکی سے ڈرنے والا انسان نہیں۔ اس طرح کی کئی ایک باتیں کر کے اُس نے اس سکھ کا دماغ کچھ درست کیا اور اُسے کہا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں اور تمہارے پاس کلہاڑی ہے۔ ہمت ہے تو پہلا وار تم کرو پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم ہرنام سنگھ سے ہرنامہ ڈاکو بن سکتے ہو یا نہیں۔ خان بازگل نے اسے یہ بھی کہہ دیا — "جس مرد کو عورت لات مار کر چلی جائے اُسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ کلہاڑی اُٹھا کر اور سر اُونچا کر کے چلے پھرے۔ تم جاؤ ہرنامے! گھر بیٹھو۔ تم مرد نہیں ہو۔"

خان بازگل نے مجھے ایک عجیب بات سنائی۔ اُس نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ ہرنام سنگھ مشتعل ہو جائے گا مگر اُس نے سر جھکا لیا اور اُس کے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ خان بازگل کو بازو سے پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے گیا اور اسے وہاں بٹھا کر کہنے لگا "خان صاحب! میں اپنی بیوی کو اس لیے نہیں ڈھونڈ رہا کہ وہ میری بیوی ہے اور بیوی عزت ہوتی ہے۔ میں اُسے اس لیے ڈھونڈ رہا ہوں کہ اُس کے سینے میں مردوں والا دل ہے جو مجھے اُس

رات معلوم ہوا جس رات وہ گھر سے بھاگی تھی۔ یہ تو میں لوگوں کے سامنے اپنی ناک رکھنے کے لیے کہتا پھرتا ہوں کہ وہ مجھے جہاں نظر آئی وہیں قتل کر دوں گا لیکن وہ مجھے مل گئی تو اپنی پگڑی اتار کر اُس کے قدموں میں رکھ دوں گا۔ میں نے اُس کی قدر نہیں کی" — ایسی ہی چند اور جذباتی سی باتیں کر کے اس نے کہا — "جس دلیری سے اُس نے قتل کیا ہے کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔"

خان بازگل نے بدک کر پوچھا — "اُس نے کیسے قتل کیا ہے؟"

ہرنام سنگھ پریشان ہو گیا۔ یہ بات جذبات کی رَو میں اُس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اُس نے پردے ڈالنے شروع کر دیئے۔

خان بازگل نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ تھانیداری کے رُعب سے نہیں دوستی کے رنگ میں پوچھ رہا ہے۔

"مجھے ایک بار پھر تھانے لے چلو اور میرے جسم کے ٹکڑے کر دو" — ہرنام سنگھ نے کہا — "یہ راز میرے منہ سے نہیں نکال سکو گے" — اُس نے یہ راز دبا لیا۔

"ہرنامے!" — خان بازگل نے اسے کہا — "تمہاری بیوی کی تلاش میں مجھے جو قربانی دینی پڑی دوں گا، مجھے یہ بتا دو کہ جس عورت کی لاش ملی ہے وہ کون تھی۔ اُسے تمہاری بیوی نے تو قتل نہیں کیا تھا؟"

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں" — ہرنام سنگھ نے جواب دیا — "اُس عورت کو تو میں جانتا ہی نہیں جس کی تمہیں لاش ملی تھی۔"

خان بازگل بہت کوشش کے باوجود اُس سے یہ راز نہ لے سکا کہ اُس

کی بیوی نے کسے قتل کیا ہے۔ وہ تھانے میں واپس چلا گیا۔

دوسرے دن ساتھ والے علاقے کا تھانیدار اُس کے پاس آیا اور اسے کہا ــــ "میرے تھانے کی ایک عورت لاپتہ ہے۔ وہ غیر شادی شدہ جوان لڑکی تھی۔ گھر سے غائب ہوگئی۔ گھر والے کئی دن اُسے خود ہی ڈھونڈتے رہے آخر انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ انہوں نے جس جس پر شک کا اظہار کیا تھا انہیں میں ٹھونک بجا کر اور چھاپے مار کر دیکھ چکا ہوں۔ لڑکی نہیں ملی۔ دو تین روز گزرے مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تمہیں ایک لاش ملی ہے جو کسی عورت کی ہے۔ لاش کے کپڑے اور جسم سے برآمد ہونے والی اشیاء تمہارے پاس ہوں گی۔ اگر تم نے ملزم پکڑ لیے ہیں تو یہ کوئی اور ہوگی۔ اگر نہیں تو مجھے اس کی چیزیں دکھا دو۔ وہ یہی گمشدہ لڑکی نہ ہو۔"

خان بازگل نے اُسے کہا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے، کہ دو کہ یہ گمشدہ لڑکی کی لاش تھی اور یہ تمہارے تھانے کی واردات ہے۔ اُس نے لڑکی کے کپڑوں کے ٹکڑے، سونے اور کانچ کی چوڑیاں، دوپٹہ اور جُوتی کا ایک پاؤں اُسے دکھایا۔ لاش سے برآمد ہونے والی اشیاء عدالت میں پیش کی جاتی ہیں۔ تھانیدار نے خان بازگل سے کہا کہ وہ اُسے اپنا ایک کانسٹیبل دے دے جسے وہ گمشدہ لڑکی کے گاؤں بھیج کر اُس کے وارثوں کو بلانا چاہتا تھا۔ گاؤں ڈیڑھ دو میل دُور تھا۔ خان بازگل نے ٹٹو کا انتظام کر کے اپنا ایک کانسٹیبل بھیج دیا۔ دوسرے تھانیدار نے گاؤں کا اتا پتا دیا تھا۔ خان بازگل نے اُسے بتایا کہ مقتولہ کی شناخت غلط ہوگئی تھی، اس لیے غلط لوگ لاش لے گئے اور جلا ڈالی۔

لاش کسی اور لڑکی کی نکلی

گمشدہ لڑکی کے لواحقین آ گئے۔ اُس کی ماں نے چُوڑیاں دیکھیں تو اُس نے پُورے یقین سے کہہ دیا کہ یہ اُس کی بیٹی کی چُوڑیاں ہیں۔ دوپٹے اور جوتی (چپل) سے تصدیق ہوگئی۔ مقتولہ کے کپڑوں کے ٹوٹکڑے دھلوائے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ماں نے سر پیٹ لیا۔ اُس نے کسی شک کی گنجائش ہی نہ رہنے دی۔ مقتولہ کے باپ نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ ان کی بیٹی کی چیزیں ہیں۔ دونوں تھانیداروں نے ضروری کاغذی کارروائی کی۔ رپورٹ لکھی۔ اُوپر بھیجی اور تفتیش دوسرے تھانیدار نے لے لی جس میں خان بازگل کی حیثیت گواہ کی رہ گئی۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کیس سے جان چھُوٹی۔

دوسرے تھانیدار نے آٹھ دس دنوں میں یہ سراغ لگا لیا کہ مقتولہ کی دوستی ہرنام سنگھ کے ساتھ تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مقتولہ کے رشتہ دار ہرنام سنگھ کے گاؤں میں بھی تھے۔ وہ اس گاؤں میں آیا کرتی تھی اور اسی لڑکی پر ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑا تھا۔ مقتولہ کے والدین نے تو کہا تھا کہ ان کی بیٹی کا چال چلن اچھا تھا لیکن دیہات میں کوئی بات چھُپی نہیں رہ سکتی۔ سکھوں میں تو بے حیائی عام تھی۔ کم ہی بُرا مانا جاتا تھا مگر ہرنام سنگھ کی بیوی کے خیالات سکھوں سے مختلف تھے۔ بعد کے حالات اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مقتولہ نے کبھی ہرنام سنگھ کی بیوی کو طعنے بھی

دیئے تھے کہ اُس کا خاوند اُس کے قبضے میں ہے۔ غالباً انہی طعنوں نے اُسے مُشتعل کیا تھا جس سے وہ ایسے جرم کی مُرتکب ہُوئی جس نے پولیس کو بھی حیران کر دیا، حالانکہ پولیس کے سامنے ایسی وارداتیں بھی آتی ہیں جو عام لوگوں کے لیے قابلِ یقین ہی نہیں ہوتیں۔

دوسرے تھانیدار نے تفتیش محنت اور دیانتداری سے کی تھی۔ اُس نے مخبروں کا استعمال بھی عقلمندی سے کیا جس کے نتیجے میں وہ ہرنام تک پہنچ گیا مگر سوال یہ تھا کہ لڑکی کو کیا ہرنام سنگھ نے قتل کیا ہے؟ اور ایسے غصے میں قتل کیا ہے کہ لاش پر کلہاڑیوں کے بیس سے زیادہ زخم تھے، سر کاٹ کر غائب کر دیا گیا تھا اور ایک بازو اور ٹانگ بھی ساتھ نہیں تھی۔ دوسرے تھانیدار کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ اس نوعیت کا قتل انتہائی غصے اور انتقام کے جذبے کے زیرِ اثر کیا جاتا ہے۔ اگر مقتولہ کو ہرنام سنگھ نے قتل کیا ہے تو اس کے باعث دو ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس لڑکی کے پیچھے پڑا ہُوا تھا اور لڑکی نے اسے دھتکار دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ لڑکی نے کسی اور کے ساتھ بھی دوستی کر لی ہو گی، مگر جو شہادتیں ملی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ لڑکی ہرنام سنگھ کے بلانے پر آ جاتی تھی۔ اس کیس کی شہادتوں میں ایک اہم شہادت غائب تھی۔ وہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔ اس سے کام کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

ایک روز دوسرے تھانیدار نے خان بازگل کے تھانے میں آ کر ہرنام سنگھ کو وہاں بلایا اور اس سے سیدھا سوال پوچھا کہ مقتولہ کے ساتھ اُس کا میل جول تھا یا نہیں۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اُسے کہا گیا کہ اُس پر قتل کا الزام عائد نہیں

کیا جا رہا بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ لڑکی کے مراسم اور کس کے ساتھ تھے۔ یہ راز ہرنام سنگھ کو ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ اسے کہا گیا کہ کوئی اور آدمی لڑکی کو پھانسنا چاہتا ہو گا لیکن ناکام ہو کر اُس نے لڑکی کو قتل کر دیا۔

اس کے جواب میں ہرنام سنگھ نے ایسا رویہ اختیار کیا جیسے وہ ان تھانیداروں کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ پرانے لوگوں کو معلوم ہے کہ سکھ احمقانہ باتوں اور حرکتوں میں شہرت یافتہ تھے۔ یہی حال ہرنام سنگھ کا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہرناما ڈاکو سمجھ رہا تھا۔ اُس کے رویے سے شک ہوتا تھا جیسے اس واردات سے وہ واقف ہے اور چھپا رہا ہے۔

خان بازگل نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے اپنی بیوی کے متعلق کہا تھا کہ جس دلیری سے اُس نے قتل کیا ہے، کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے جواب میں ہرنام سنگھ نے ایسی احمقانہ باتیں کیں کہ اس کے خلاف شک پکا ہو گیا۔ مقتولہ کے متعلق گاؤں کے نمبردار نے بتایا تھا کہ بڑی اچھی صورت کی لڑکی تھی لیکن کوئی شریف گھرانہ اس کا رشتہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ منہ پھٹ اور بے حیا تھی۔ سکھوں کے ہاں بے حیائی کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں تھانیداروں نے محسوس کیا کہ واردات کے ساتھ ہرنام سنگھ کا گہرا تعلق ہے۔ انہوں نے اسے دوستانہ طریقے سے سمجھایا۔ پیار اور محبت کے سارے ڈھنگ آزمائے مگر وہ نہ مانا۔ اس کی بجائے وہ چیلنج کے انداز سے باتیں کرتا تھا۔

اُسے اُسی کمرے میں لے گئے جہاں خان بازگل نے اُسے ایک دن اور

رات رکھا تھا۔ دوسرا تھانیدار تشدد اور اذیت رسانی (ٹارچر) کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اس کے بال نہ باندھے اور اس قسم کی کوئی اذیت نہ دی۔ اسے کمرے میں کھڑا رکھا گیا۔ پانی کا گھونٹ تک نہ دیا گیا۔ پھر اُسے خالی پیٹ اسی علاقے کی کشید کی ہوئی شراب پلائی گئی۔ یہ دیسی شراب بہت ہی تیز ہوتی ہے۔ اسے بیٹھنے نہیں دیا گیا۔ شام کے بعد اسے بھنگ پلائی گئی۔ بھنگ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے نشے میں آدمی ہنسنا شروع کر دے تو گھنٹوں ہنستا ہی رہتا ہے اور اگر رونے لگے تو روتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی عقل مند آدمی اُس کے ذہن میں اپنے مطلب کی کوئی بات ڈال دے تو اسی کے متعلق بولنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھے خان باز گل نے بتایا تھا کہ بھنگ میں کچھ اور بھی ملایا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کیا چیز تھی۔ میں اس سے واقف بھی نہیں تھا۔ دوسرا تھانیدار اس کا استعمال جانتا تھا۔

سکھوں کے اس علاقے کے متعلق میں یہ بھی بتا دوں کہ وہاں تھانیداروں کو قتل اور خون خرابے کی وارداتوں میں لمبی چوڑی تفتیش اور اذیت رسانی کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی کیونکہ سکھ خاندانی دشمنی کی بنا پر لڑتے اور مرتے تھے۔ ایسے لڑائی جھگڑوں میں قاتلوں کو پکڑنا مشکل نہیں ہوتا تھا بلکہ اکثر قاتل آلۂ قتل لہراتے اور للکارتے ہوئے سارے گاؤں کا چکر لگاتے اور تھانے چلے جاتے تھے۔ پراسرار وارداتیں کبھی کبھار ہوتی تھیں جیسے اس لڑکی کا قتل تھا۔ ایسے قاتلوں سے اقبالِ جرم کرانے کے لیے تھانیداروں نے اپنے اپنے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔

بھنگ نے بھانڈا پھوڑ دیا

اس تھانیدار نے ہرنام سنگھ کو خالی پیٹ دیسی شراب پلائی۔ اس کا اثر بہت بُرا ہُوا ہوگا۔ اس کے بعد اُسے بھنگ میں ملا کر کچھ پلایا اور اُسے کھانے کے لیے بھی کچھ دیا۔ تھانیدار اس کے پاس بیٹھ گیا اور جب ہرنام سنگھ پر نشہ طاری ہونے لگا تو اُس نے دوستانہ لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی مردانگی کی خوب تعریفیں کیں اور کہا کہ جو لڑکی قتل ہوگئی ہے وہ اُس پر مرتی تھی۔ بہرحال وہ ہرنام سنگھ کے ذہن کو اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ تھانیدار کوئی بہت ہی عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ سے کوئی سوال پوچھا ہی نہیں! اپنے شکوک کے مطابق اُس کے ذہن میں باتیں ڈالتا رہا جن میں ایک بات یہ بھی تھی (جو اُسے خان باز گل نے بتائی تھی) کہ اس کی بیوی نے جس دلیری سے قتل کیا ہے کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔

ہرنام سنگھ نے جھوم جھوم کر راز فاش کر دیا۔ اُس نے واردات کی جو کہانی سنائی وہ ناقابلِ یقین لگتی تھی۔ دونوں تھانیداروں نے یہ رائے قائم کی کہ ہرنام سنگھ نشے کے اثر سے اُوٹ پٹانگ باتیں گھڑتا جا رہا ہے۔ اُس نے پہلے تو مقتولہ کے ساتھ اپنی محبت کی داستان مست ہو کر سنائی اور بعد کی ملاقاتوں کی تفصیل بھی سنائی۔ اُس کی بیوی کو پتہ چل گیا۔ بیوی نے اُسے روکا تو اس نے بیوی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ ہرنام سنگھ نے یہ حرکت بھی کی کہ لڑکی جب اُس

کے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں آتی تھی تو ہرنام سنگھ اُسے اپنے گھر بلاتا اور اپنی بیوی سے کہتا تھا کہ دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی مجھ پر فدا ہے یہ اصل سکھوں والی حرکت تھی۔ لڑکی بھی سکھ ہی تھی۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی بیوی کو طعنے دیئے اور ہرنام سنگھ کی موجودگی میں کہا کہ تم ہرنام سنگھ جیسے جوان کے قابل نہیں ہو۔ اس پر گھر میں لڑائی ہوئی۔ ہرنام سنگھ کی بیوی لڑکی کو مارنے کے لیے دوڑی۔ ہرنام سنگھ نے اُسے گرالیا اور بہت ہی بُری طرح پیٹا۔ ایک بار یُوں بھی ہُوا کہ بیوی کلہاڑی اُٹھا کر ہرنام سنگھ پر ٹوٹ پڑی۔ ہرنام سنگھ کے بھائیوں نے درمیان میں آکر بچاؤ کرادیا۔

ہرنام سنگھ نے بتایا کہ اُسے بیوی نے کئی بار کہا تھا کہ جس طرح مسلمان اپنی بیویوں کو رکھتے ہیں اس طرح رہوں گی، ورنہ مجھے طلاق دے دو۔ اگر مجھے آزاد نہیں کرو گے تو میں کسی مسلمان کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ اس پر بھی ہرنام سنگھ نے اُسے مارا پیٹا۔ اُس نے تھانیداروں کو نشے کی حالت میں بیان دیتے ہوئے اپنی بیوی کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں آتی جاتی تھی اور مسلمانوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا لیکن وہ بہت دلیر لڑکی تھی۔ اُس نے جب اپنا آپ دکھایا تو میں نے قسم کھالی کہ تمام عمر اس عورت کا غلام رہوں گا۔

یہ واقعہ اُس نے اس طرح سنایا کہ ایک رات وہ چھت پر سویا ہُوا تھا۔ اُس کی بیوی کی چارپائی اُس کے ساتھ تھی۔ اس کے دونوں بھائی مکان سے باہر کھلی جگہ چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ صحن میں اُس کی ماں اور باپ

سوئے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ کی ویسے ہی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے ساتھ والی چارپائی خالی دیکھی۔ بیوی غائب تھی۔

ہرنام سنگھ کو پہلا خیال یہ آیا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن اسے یقین نہ آیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ ذرا نیچے اُتر گئی ہوگی۔ وہ لیٹ گیا۔ یہ دیہاتی طرز کا کچا مکان تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہرنام سنگھ کو مکان کے پچھواڑے سے ہلکی سی آواز آئی۔ رات اندھیری تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے اُدھر دیکھا تو منڈیر سے کسی کا سر اُوپر اُٹھا پھر کسی کا باقی جسم اُوپر آیا۔ ہرنام سنگھ نے دیکھ لیا کہ یہ کسی عورت کا سایہ ساتھا جو اُس کی بیوی ہی ہوسکتی تھی، مگر اس کی بیوی پچھواڑے سے کیوں اُوپر آرہی تھی؟ اُسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ منڈیر سے چارپائیاں دُور نہیں تھیں۔ اس عورت کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ وہ کلہاڑی اُوپر کرکے ہرنام سنگھ کی طرف تیزی سے آئی۔

ہرنام سنگھ کی قسمت اچھی تھی کہ جاگ رہا تھا۔ کلہاڑی کا وار اپنے اُوپر پڑنے سے اتنی دیر پہلے اچھل کر اُٹھا کہ کلہاڑی اُس کے سرہانے پر لگی۔ ہرنام سنگھ نے پھُرتی دکھائی۔ عورت کو اس نے دوسرا وار نہ کرنے دیا۔ بڑی ہی تیزی سے اُس نے کلہاڑی پکڑ لی۔ وہ اُس کی بیوی تھی۔ بیوی نے اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ وہ آخر عورت تھی۔ اُس کا مقابلہ تندرست جوان کے ساتھ تھا۔ ہرنام سنگھ نے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اُس کی بیوی کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ہرنام سنگھ نے اسے نیچے گرالیا اور اُس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے کلہاڑی کا دستہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیوی کی

شہ رگ پر رکھا اور زور سے دبایا۔ بیوی تڑپ اُٹھی۔

"کس یار کے پاس گئی تھی"؟— ہرنام سنگھ نے پوچھا— "تمہیں کس نے میرے قتل کے لیے بھیجا ہے"؟— اُس نے دستے کا دباؤ ڈھیلا کر دیا۔

"میں جانتی ہوں تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے"— اس کی بیوی نے کہا— "میں نہ قتل ہونے سے ڈرتی ہوں نہ قتل کرنے سے۔ قتل ہونے سے پہلے تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں کیا کر کے آئی ہوں"۔

بیوی نے اُسے جو قصہ سنایا وہ یوں تھا کہ اُس روز مقتولہ ہرنام سنگھ کے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ ہرنام سنگھ کی بیوی نے اس وقت تک معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو جب وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تھی کس کے ہاتھ پیغام بھیجا کرتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان دونوں کی ملاقاتیں دونوں گاؤں کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ لڑکی ہرنام سنگھ کے بلانے پر آجایا کرتی تھی۔ بیوی نے اس عورت کو پیسے دیئے اور کہا کہ اس لڑکی کو ہرنام سنگھ کی طرف سے کہے کہ رات فلاں جگہ آجانا۔ اُس کی چال کامیاب رہی۔ دیہات میں لوگ شام کے فوراً بعد سو جاتے ہیں۔ ہرنام سنگھ سو گیا تو بیوی اٹھی۔ دبے پاؤں نیچے گئی۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی کلہاڑی اپنی مرضی کی جگہ رکھ لی تھی۔ وہ اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ اُس نے شام سے کچھ دیر پہلے پچھواڑے سیڑھی رکھ دی تھی۔ یہ چار پانچ ڈنڈوں کی معمولی سی سیڑھی تھی جو دیہات میں اکثر مکانوں کے ساتھ لگی نظر آتی ہے۔

بیوی نے ہرنام سنگھ کو بتایا کہ وہ اُس جگہ پہنچی جہاں اُس نے لڑکی کو بلایا تھا تو تھوڑی ہی دیر بعد وہ آگئی۔ لڑکی نے ذرا دھیمی آوازیں دیں—

"ہرنامے۔ ہرنامے"۔

وہ جسے آوازیں دے رہی تھی وہ ہرنامے کی بیوی تھی۔ اندھیرے میں یہ دونوں سائے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو ہرنام سنگھ کی بیوی نے کلہاڑی کا ایک ایسا زبردست وار کیا کہ لڑکی کی گردن صاف کٹ گئی۔ پھر اُس نے لڑکی کا ایک بازو اور ایک ٹانگ کاٹ دی۔ اُس کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور واپس ہرنام سنگھ کو قتل کرنے کے لیے آئی۔ اس نے ہرنام سنگھ سے پہلے لڑکی کو اس لیے قتل کیا تھا کہ چھت پہ ہی نہ پکڑی جائے۔ آخر وہ پکڑی گئی مگر وہ لڑکی کو قتل کر چکی تھی۔

ہرنام سنگھ کو اپنی بیوی کی اس کہانی پر اعتبار نہ آیا۔ وہ اُسے اُس جگہ لے گیا جہاں لڑکی قتل ہوئی تھی۔ وہاں واقعی لاش پڑی تھی، اور لاش کے ٹکڑے بھی قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ نے اپنی بیوی کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے دل میں یہ غیرت جاگ اُٹھی کہ وہ اپنی بیوی کو پولیس کے ہاتھ میں نہیں دے گا اور اُسے کچہری نہیں چڑھنے دے گا۔ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ بیوی اُس کی عزت ہے اور اس کی بیوی نے اپنی عزت اور غیرت کی خاطر اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔ یہ جنگلی سکھ کا دماغ تھا۔ جدھر رُخ ہو گیا ہرنام سنگھ اُسی سمت چل پڑا۔ اپنی بیوی کی یہ دلیری اُسے بہت پسند آئی۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ اُس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اُس نے کلہاڑی سے گڑھا کھود کر لاش دبا دی اور اس سے تھوڑی دُور ایک گڑھا گہرا کھود کر سر دبایا اور ٹانگ اور بازو ایک اور جگہ دبایا۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ

وہ بے غم ہو جائے اُسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

اس کے بعد ہرنام سنگھ نے جو بات سنائی وہ بھی مشکوک لگتی تھی۔ خیال یہی تھا کہ وہ نشے کے اثر کے تحت خیالی باتیں کر رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ بیوی کو واپس لے آیا۔ اندھیرے میں نظر نہیں آتا تھا کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہیں یا نہیں۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ نے بیوی سے کہا کہ وہ دبے پاؤں کپڑے بدل لے اور کل یہ کپڑے دھو لے مگر کوئی خون نہ دیکھ سکے۔ وہ اطمینان سے سو گئے۔

آدھی رات کے بہت بعد ہرنام سنگھ کی آنکھ پھر کھلی تو پھر دیکھا کہ بیوی غائب ہے۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ وہ نظر نہ آئی۔ صبح ہو گئی۔ وہ نہ آئی۔ سورج نکلنے کے بعد تک نہ آئی۔ ہرنام سنگھ کی ماں نے کسی شک کی بنا پر ٹرنک دیکھا۔ تمام زیورات غائب تھے اور دوسرے ٹرنک میں کچھ رقم رکھی تھی، وہ بھی غائب تھی۔

ہرنام سنگھ کو کئی خیال آئے۔ ایک یہ کہ وہ اس ڈر سے بھاگ گئی ہے کہ ہرنام سنگھ اُسے پیار کے دھوکے میں پکڑوا دے گا۔ دوسرا یہ کہ اُس نے درپردہ کسی اور کے ساتھ دوستی لگا رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ تیسرا یہ کہ لڑکی کو اس کی بیوی نے قتل نہیں کیا، اس آدمی نے کیا ہے جس کے ساتھ وہ چلی گئی ہے۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہتا کہ اس کی بیوی بہت دلیر تھی۔ لڑکی کو اُسی نے قتل کیا ہے

بہرحال اُس نے بیوی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اُس نے مسلمان گھرانوں

کے دو جوان آدمیوں کو دھمکیاں بھی دیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ وہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ اُس کی بیوی کہیں چلی گئی ہے۔ اُدھر اُس لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی جو قتل ہو چکی تھی۔ ہرنام سنگھ سے بھی پوچھا گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کے گاؤں میں آئی تھی۔ جس طرح ہرنام سنگھ اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو نہیں دینا چاہتا تھا اسی طرح مقتولہ کے لواحقین بھی سکھ تھے۔ وہ بھی اسے اپنے طور پر تلاش کر رہے تھے۔ وہ اپنی لڑکی کے چال چلن سے واقف ہوں گے اس لیے انہیں یہی شک ہو گا کہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔

چوتھے پانچویں دن درندوں نے لاش نکال لی۔ ہرنام سنگھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک مخبر نے خان باز گل کو اطلاع دے دی ہے کہ اس کی بیوی لاپتہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاش برآمد ہوتے ہی خان باز گل نے ہرنام سنگھ کو دھر لیا۔ لاش کی شناخت دانستہ کرائی۔ اِس سے یہ ہوا کہ لڑکی کے لواحقین کو یہ شک ہوا ہی نہیں کہ یہ لاش اُن کی لڑکی کی ہو سکتی ہے۔ لاش غلط وارثوں کو دے دی گئی جو انہوں نے اپنے دستور کے مطابق جلا ڈالی۔

اس واردات میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہرنام سنگھ نے خان باز گل کے ہاتھوں اپنا جسم تڑوا لیا لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ لاش فلاں لڑکی کی ہے اور اسے اُس کی بیوی نے قتل کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر بھی گیا ہو۔ لاش کو اُس نے خود دفن کیا تھا۔

ناقابلِ یقین کہانی سچ نکلی

خان بازگُل نے مجھے بتایا کہ اُس نے ہرنام سنگھ کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ دوسرے تھانیدار نے کہا کہ اس کا سارا بیان سچّا نہیں ہوسکتا۔ اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ ہرنام سنگھ بیان دے کر سو گیا تھا۔ وہ بہت ہی دیر سویا رہا۔ جب جاگا تو اُسے کھلایا پلایا گیا۔ اس کے ہوش ٹھکانے آچکے تھے۔ دوسرے تھانیدار نے اُسے کہا کہ ساتھ چل کر لاش کا سر، بازو اور ٹانگ برآمد کراؤ۔

"کونسی لاش؟" — ہرنام سنگھ نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کس کی لاش؟"

اُسے اُس کا بیان یاد دلایا گیا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے مجھے شراب پلائی پھر بھنگ پلائی۔ میں نے راضی خوشی پی لی۔ مجھے اتنا زیادہ نشہ ہوگیا تھا کہ اپنی بھی ہوش نہیں تھی۔ میں بیان دینے کی حالت میں ہی نہیں تھا۔

"ہرنامے!" — اُسے خان بازگُل نے کہا — "قاتل تم نہیں ہو تمہاری بیوی ہے، اور وہ لاپتہ ہے۔ تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ تم صرف اتنا کرو کہ لاش کے ٹکڑے برآمد کرادو۔ یا یہ بتادو کہ تم نے لاش والے گڑھے سے کس طرف اور کتنی دُور دبائے تھے۔ ہم خود نکال لیں گے۔"

اُس نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

دوسرے تھانیدار نے خان بازگُل سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے لڑکی کو اس نے خود قتل کیا ہے اور یہ اتفاق ہے کہ اس کی بیوی لاپتہ ہوگئی ہے۔ خان بازگُل کو معلوم تھا کہ ہرنام سنگھ کی بیوی کہاں ہے۔ اُس کے ساتھ اس کی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کانسٹیبل نے اس کے سامنے خان بازگُل کو سنایا تھا کہ ہرنام سنگھ کی بیوی کس طرح اُس کے پاس پہنچی تھی۔ اُس نے قتل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خان بازگُل نے یہ بھی سوچا کہ قتل کا اقبال کون کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے ہرنام سنگھ کی بیوی نے ہی قتل کیا ہو۔ انسان کی فطرت بڑی گہری ہوتی ہے۔ خان بازگُل نے بہت کچھ سوچ کر دوسرے تھانیدار کو مشورہ دیا کہ وہ ہرنام سنگھ کو گرفتار کرکے لے جائے اور اس کے بیان کے مطابق شہادت اکٹھی کرلے۔

ایسا ہی کیا گیا۔ وہ تھانیدار ہرنام سنگھ کو گرفتار کرکے لے گیا۔

اپنی تسکین اور تصدیق کے لیے خان بازگُل کسی بہانے امرتسر چلا گیا۔ اُسے کانسٹیبل مل گیا۔ اُس نے گجرات کے تبادلے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور ہرنام سنگھ کی بیوی کو اُس نے اپنے ساتھ رکھا ہُوا تھا۔ خان بازگُل نے اُسے ہرنام سنگھ کا بیان سنایا تو کانسٹیبل کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"آپ تفتیش کے لیے آئے ہیں؟" — اس نے پوچھا۔

خان بازگُل نے اُسے تسلی دی کہ وہ اپنے وعدے پر قائم ہے اور وہ صرف اپنی دلچسپی کے لیے اصل واردات معلوم کرنا چاہتا ہے۔

کانسٹیبل اُسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی (ہرنام سنگھ کی سابقہ بیوی)

سے ملایا۔ بات ہوئی تو اس لڑکی نے یہ تسلی کر کے کہ خان باز گل دھوکہ نہیں دے گا، ہرنام سنگھ کا بیان سننے سے پہلے ہی سنا دیا کہ اس نے اس لڑکی کو کس طرح قتل کیا تھا۔ اُس نے بالکل وہی کہانی سنائی جو ہرنام سنگھ نے نشے کی حالت میں سنائی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اُس نے جو بھی چال چلی وہ کامیاب رہی۔ اُس نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی جو اُس کے متعلق مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ مسلمان عورتوں سے زیادہ متاثر تھی اور انہی کی طرح اپنے آپ کو، اپنے خاوند کو اور اپنے گھر کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہتی تھی۔

اپنے گھر کی غلاظت سے وہ پریشان رہتی تھی۔ اس پر ہرنام سنگھ نے یہ ظلم کیا کہ ایک لڑکی کو اپنے دل اور دماغ پر سوار کر کے اُسے اپنی بیوی پر بھی سوار کرنے کی کوشش کی۔ بیوی کے دل میں ہرنام سنگھ اور اس گھر کے ہر فرد کے خلاف نفرت پہلے ہی گھر کر گئی تھی۔ اس لڑکی نے اُسے طعنے دیئے اور ہرنام سنگھ نے اسے مارا پیٹا تو اس کے دماغ پر خون چڑھ گیا۔ اُسے پناہ اور سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ اس مسلمان کانسٹیبل نے پوری کر دی۔ آخر ایک روز اُس نے لڑکی کو پھر اپنے گاؤں میں دیکھا تو اس کا دماغ تیز ہو گیا۔ اس نے قتل کی سکیم بنائی۔ اس کی سکیم میں ہرنام سنگھ کا قتل شامل نہیں تھا اور نہ ہی وہ زیورات چوری کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے ایک عورت کی زبانی لڑکی کو ہرنام سنگھ کا پیغام بھیجا۔ کلہاڑی الگ رکھ لی اور شام کے وقت سیڑھی منڈیر پر ایک جگہ لیپ کرنے کے بہانے مکان کے پچھواڑے لگا دی۔ رات کو وہ پچھواڑے سے اترنا چاہتی تھی۔ اُس نے گھر والوں کی نظر بچا کر کلہاڑی اپنے بستر میں چھپا

لی تھی۔

ہرنام سنگھ سو گیا تو اُس نے کلہاڑی اُٹھائی اور پیچھے سے اُتر گئی۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ اگر لڑکی آ گئی تو اُسے قتل کر کے رات ہی رات امرتسر پہنچ جائے گی۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ لڑکی آئے گی لیکن موت اُسے لے آئی۔ بیوی نے پہلا وار لڑکی کے سر پر کیا۔ وہ چکرا کر گری تو اُس نے دُوسرا وار اُس کے بازو پر کیا۔ بازو چونکہ زمین پر تھا اس لیے صاف کٹ گیا۔ تیسرا وار ٹانگ پر کیا۔ اسی جگہ دو اور وار کیے تو ٹانگ بھی کٹ گئی۔ وہ پوری طرح پاگل ہو چکی تھی۔ مقتولہ کے جسم کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ بیوی نے پاگل پن میں کلہاڑی سے اُس کی گردن کاٹ کر سر الگ کر دیا۔ پھر اندھا دُھند اُس کے جسم پر کلہاڑی چلانے لگی۔

اس دوران اُس کے دماغ میں آئی کہ وہ ہرنام سنگھ کو بھی قتل کرے گی۔ یہ پاگل پن کا اثر تھا۔ اسے آپ یوں کہہ لیں کہ یہ دماغ پر ایک قتل کا خون سوار ہو جانے کا اثر تھا۔ وہ اسی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں ہرنام سنگھ کو قتل کرنے گھر کو واپس آ گئی اور چھت پر چڑھی۔ ہرنام سنگھ جاگ رہا تھا۔ اس سے آگے اُس نے وہی کہانی سُنائی جو ہرنام سنگھ نے سُنائی تھی۔ اس لڑکی نے خان باز گل کو سُنایا کہ ہرنام سنگھ نے اس کے ساتھ جا کر لاش کو کرمچھا کھود کر دبایا اور لاش کے اعضاء بھی دبا دیئے۔ اُس نے بیوی کو اس دلیری اور غیرت مندی پر خوب شاباش دی اور چھت پر لا کر سو جانے کو کہا۔ اس کے اس سلوک سے بیوی کے دل سے یہ ارادہ نکل گیا کہ وہ ہرنام سنگھ کو قتل کرے گی۔ ہرنام سنگھ وحشی قسم کا سکھ تھا۔ بے سُدھ سو گیا۔ بیوی کو اچانک خیال آیا کہ یہ شخص اُسے دھوکے

گھر لے آیا ہے اور صبح پولیس کے حوالے کر دے گا۔ وہ تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی اتنی گہری دوستی تھی اُس کے قتل پر وہ خوش ہو گا۔

اس جوان لڑکی کا خون ذرا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دماغ ذرا بہتر طریقے سے سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اُس نے فرار میں ہی خیریت سمجھی۔ وہ اُٹھی اور نیچے چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے اندھیرے میں ہی ٹرنک کھولا۔ اُسے معلوم تھا کہ زیورات کہاں پڑے ہیں۔ رقم کے متعلق بھی اُسے علم تھا۔ اُس نے دونوں چیزیں اُڑا لیں اور نکل گئی۔

گاؤں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ وہ گاؤں سے نکل گئی اور دس گیارہ میل پیدل چلتی امرتسر پہنچ گئی۔ ابھی سحر دُھندلی تھی جب وہ امرتسر پہنچی۔ وہ دربار صاحب چلی گئی۔ اُس روز اس کا کانسٹیبل ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ صبح ہوئی تو وہ پوچھتی پوچھتی کانسٹیبل تک پہنچ گئی۔ کانسٹیبل نے جس طرح پہلے سنایا تھا، اُس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے رہائش کا بندوبست کر لیا۔ لڑکی کو مسلمان کیا اور شادی بھی کر لی۔

کیا یہ گناہ تھا؟

خان بازگُل نے لڑکی سے پوچھا کہ مقتولہ کا سر، ٹانگ اور بازو کہاں کہاں دبائے گئے تھے۔ لڑکی نے لاش والے گڑھے سے سمت اور اندازاً فاصلہ بتا دیا۔ کانسٹیبل ابھی تک گھبرایا ہُوا تھا۔ خان بازگُل نے اسے کہا کہ وہ اُس کا

مسلمان بھائی ہے۔ اسے دھوکہ نہیں دے گا۔ اُس نے یہاں تک اُس کی مدد کی کہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس کے دو دوست انسپکٹر تھے۔ اس نے انہیں کہا کہ اس کانسٹیبل کو امرتسر سے گجرات، جہلم یا اس علاقے کے کسی تھانے میں بھجوا دیں۔ اس نے کوئی جھوٹ موٹ کی وجہ بتائی۔ انہوں نے مدد کا وعدہ کیا۔

دو روز بعد یہ کیس پھر خان بازگُل کے تھانے میں آ گیا کیونکہ قتل اس کے تھانے کے علاقے میں ہُوا تھا اور مشتبہ ملزم (ہرنام سنگھ) بھی اسی علاقے کا تھا۔ ہرنام سنگھ کو خان بازگُل کے حوالے کر دیا گیا۔ اس پٹھان کو تو معلوم تھا کہ قاتل کون ہے لیکن اس قاتل کو وہ مظلوم سمجھتا تھا اور اب اسلام کا رشتہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ کو اقبالِ جرم کے لیے نہ کہا۔ وہ جرم کی کہانی سُن چکا تھا۔ اس نے پہلی کارروائی یہ کی کہ گاؤں کے دو آدمیوں کو جو اس کے اپنے خوشامدی تھے، تھانے بلایا۔ ہرنام سنگھ کو ہتھکڑیوں میں ساتھ لیا اور اُس جگہ لے گیا جہاں سے لاش برآمد ہُوئی تھی۔ ہرنام سنگھ کی سابقہ بیوی نے اُسے بتا دیا تھا کہ لاش کے اعضاء کہاں کہاں دبائے گئے ہیں۔ خان بازگُل نے کھدائی کے لیے دیہات سے دو تین آدمی ساتھ لے لیے تھے۔ اس نے بتائے ہوئے اندازے کے مطابق ایک جگہ دیکھی جہاں پتہ چلتا تھا کہ کچی ہے۔ اس نے ہرنام سنگھ سے پوچھا "یہاں سر ہے یا کونسا حصّہ؟"

ہرنام سنگھ نے جواب دیا "مجھے کچھ بھی یاد نہیں"۔

خان بازگُل نے سب کو بلایا اور کھدائی کرائی۔ اسی طرح ایک اور جگہ سے کھدائی کرائی۔ ایک جگہ سے سر اور دوسری جگہ سے ٹانگ اور بازو برآمد

ہوئے۔ ان کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ خان باز گُل نے برآمدگی کے کاغذات تیار کیے جن میں لکھا کہ یہ اعضا۔ ہرنام کی ایسی نشاندہی پر برآمد ہوئے ہیں جو اُس نے اپنی رضامندی سے کی ہے۔ اس نے کھدائی کرنے والوں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے دو آدمیوں کے انگوٹھے لگوا لیے۔

یہ اعضاء امرتسر کے سول سرجن کے معائنے اور رپورٹ کے لیے بھیج دیئے۔ پھر اُس نے ہرنام سنگھ کے گھر کی تلاشی لی اور آلۂ قتل (کلہاڑی) برآمد کیا۔ اس کے متعلق بھی اس نے لکھا کہ ہرنام سنگھ کی نشاندہی پر برآمد ہُوا ہے۔

اس نے اپنے ایک مُخبر کو یہ بیان دینے کے لیے تیار کیا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی اور ہرنام سنگھ بھی اس کی دوستی کا خواہش مند تھا۔ ناکامی سے مشتعل ہو کر اُس نے لڑکی کو قتل کر دیا۔ مخبر سے یہ بھی کہلوایا گیا کہ ہرنام سنگھ نے اُسے بھی قتل کی دھمکی دی تھی۔ مقتولہ کے باپ اور بھائیوں کے ذہن میں بھی خان باز گُل نے ڈالا کہ لڑکی کا قاتل ہرنام سنگھ ہے۔ انتقام لینے کے لیے ان لوگوں نے وہ بیان زبانی یاد کر لیے جو انہیں خان باز گُل نے بتائے تھے۔ اس کے علاوہ خان باز گُل نے جو جھوٹی شہادتیں تیار کیں وہ ایک لمبی روئیداد ہے۔ اُس نے بڑی عقل مندی سے کیس تیار کیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے ابتدائی سماعت کے بعد کیس سیشن سپرد کر دیا جہاں سے ہرنام سنگھ کو عمر قید کی سزا مل گئی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی جو مسترد ہو گئی اور سزا بحال رہی۔

اس سے پہلے مسلمان کانسٹیبل کو امرتسر سے گجرات بھیج دیا گیا تھا۔

اس طرح ہرنام سنگھ کی سابقہ بیوی خطرے کے علاقے سے بہت دُور چلی گئی تھی۔

خان باز گُل نے مجھے یہ کہانی اس سوال کے ساتھ سُنائی تھی کہ اُس نے گناہ تو نہیں کیا؟

میں یہ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

○○○